فروری 2021ء

ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

انصاف کرو ورنہ یاد رکھنا؟

صفحہ 5

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

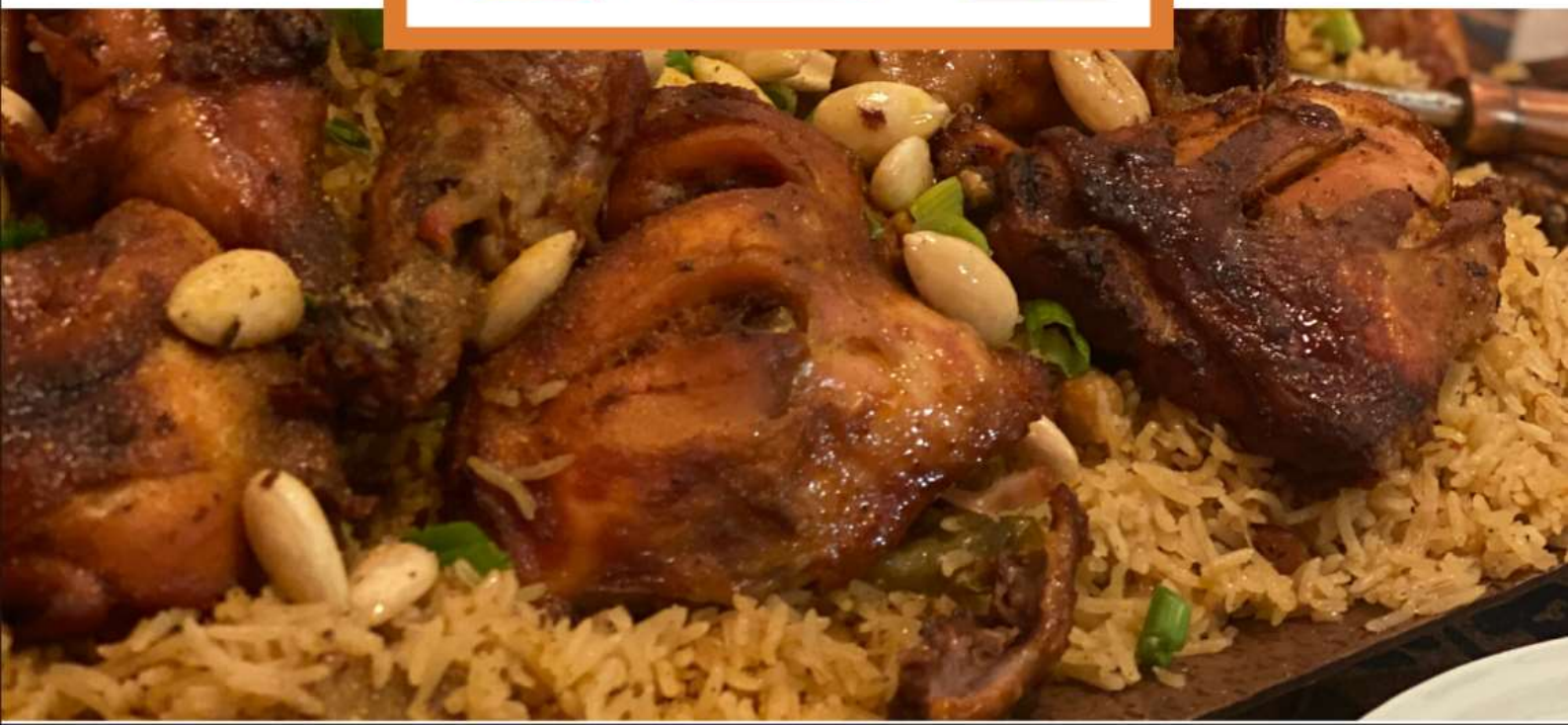

ھُوَالناصر — خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم — گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 6 شمارہ نمبر: 02 ربیع الثانی 1442 فروری 2021ء

اس شمارہ میں

درس قرآن کریم 04

انصاف کرو ورنہ یاد رکھنا؟ 05

لفظ پاکستان کس نے تخلیق کیا؟؟؟ 07

چلی کے کانکن اور ہمارے مقامی چاہ کن 10

احترام انسانیت 11

کیا عمران خان جنرل باجوہ سے کچھ سیکھ سکتے ہیں؟ 15

مودودی کی فکر اور دو قومی نظریہ سے مایوسی کا سفر 17

پبلک سروس کمیشن! یا ٹھہرا ہوا پانی؟ 20

علامہ اقبال اور قادیانیت: تعلق اور لاتعلقی 22

کرک میں کس کی سمادھی ہے جسے دو بار مسمار کیا گیا؟ 23

کرکٹ کے لٹل ماسٹر حنیف محمد کے کارنامے 24

سر ایڈورڈ ڈگلس میکلیگن، علامہ اقبال اور سر کا خطاب 26

بلوچستان کا ہزاروں سال قدیم پنوں قلعہ عدم توجہ کا شکار 28

بھیرہ حکومتی توجہ کا منتظر 30

سعودی تیل کی کہانی 31

وادیٔ کشمیر 33

فرانس میں لاہور کی سکھ شہزادی کیوں مشہور ہے؟ 35

تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا بحران 37

جب نواب منصور علی خان پٹودی کی برات شرمیلا ٹیگور کے گھر اتری 38

17 ویں صدی کی خاتون جس نے دنیا کا سب سے پراسرار اور مہلک زہر بنایا 40

اسرائیل کے جاسوسی کے سافٹ ویئر سے پرینکا گاندھی کا فون بھی ہیک ہوا تھا 42

جمہوریت ہی نہیں ہندوازم بھی سخت گیریت کی زد میں 45

انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کی سرحد پر 'ڈاکوؤں کا چھوٹا سا ملک' 46

ایشیا کا وہ ملک جو راتوں رات ہی مالدار ہو گیا 48

سعودی عرب: درسی نصاب تعلیم میں اہم تبدیلیاں 50

انسانی پیدائش کا مقصد 52

کبھی کوئی شخص جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا 54

ہر نسل اک فصل ہے دھرتی کی، آج اُگتی ہے کل کٹتی ہے 56

شہید افگار بخاری 58

عورتوں سے باتیں کرنا 59

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے) +47-91698367

ظہیر الدین عباسی (جرمنی) +49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا) +41-6433112

عابد شمعون چاند (سعودی عرب)

ابن الامین (برطانیہ) +44-7940077825

بلال طاہر (کراچی، پاکستان) +92-3327051887

رحمت اللہ میر بلوچ (بیورو چیف بلوچستان)

محمد ثناء اللہ (بیورو چیف وسطی پنجاب)

چوہدری مقبول احمد (بھارت) +91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 3 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com

m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے

اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

ADVERTISEMENT TARIFF

(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا۔ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ۔اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ۔ (سورۃ السجدۃ آیت: 22-23-27)

ترجمہ:

اور ہم یقیناً انہیں بڑے عذاب سے ورے چھوٹے عذاب میں سے کچھ چکھائیں گے تا کہ ہو سکے تو وہ (ہدایت کی طرف) لُوٹ آئیں۔ اور کون ان سے زیادہ ظالم ہوسکتا ہے جو اپنے رب کی آیات کے ذریعہ اچھی طرح نصیحت کیا جائے پھر بھی ان سے منہ موڑ لے؟ یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں۔

پس کیا اس بات نے انہیں ہدایت نہیں دی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں جن کے (چھوڑے ہوئے) گھروں میں وہ چلتے پھرتے ہیں۔ یقیناً اس میں بہت سے نشانات ہیں۔ پس کیا وہ سنتے نہیں۔

تفسیر:

دنیا میں اس لئے عذاب آتے ہیں تا کہ لوگ ان بداعمالیوں سے باز آویں جن میں وہ گرفتار ہیں دوسرے مقام پر لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ (انعام:43) فرمایا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ: انبیاء اور ان کے نشانوں کے منکر اور ان سے اعراض کرنے والے سب سے بڑے ظالم ہیں اور خدا تعالیٰ ایسے قطع تعلق کرنے والوں کو ضرور سزا دیگا۔

فرمایا كَمْ اَهْلَكْنَا: ہدایت کا ذریعہ ایک یہ بھی ہے کہ پچھلی قوموں کی حالت پر غور کیا جاوے۔ راست باز اپنے مخالفوں کے مقابل میں کامیاب ہوتا ہے اور شریر و مفسد تباہ و ہلاک ہو جاتے ہیں۔ (حقائق الفرقان جلد سوم صفحہ نمبر 384 / 387)

ایک نصیحت

بوعلی سینا کے ایک شاگرد نے کہا۔ استاد آپ نبوت کا دعویٰ کرو۔ اس وقت تو آپ خاموش رہے۔ بعد ازاں ایک موقعہ پر جبکہ ہوا تیز و سرد تھی اور پانی یخ بستہ۔ اس نے شاگرد کو حکم دیا کہ کپڑے اتار کر اس میں کود پڑو۔ اس نے استعجاب کی نظر سے دیکھا۔ بوعلی سینا نے پوچھا؟ کیوں؟ کہا۔ آپ کو جنون تو نہیں ہو گیا؟ اس پر حکیم بولا نادان تیرے جیسے فرماں برداروں کی امید پر نبوت کروں؟ دیکھ ایک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرو تھے۔ کہ خون بہا دیئے۔ اور گھمسان کی جنگوں میں جہاں موت سامنے دکھائی دیتی۔ سر کٹوانے کا حکم دیا اور انہوں نے چوں تک نہ کی۔ اور ایک تو ہے کہ جانتا ہے کہ میں طبیب ہوں۔ پھر سردی سے ڈرتا ہے! صحابہؓ کی مرہم پٹی کو بھی تسلی بخش انتظام نہ تھا۔ بوعلی سینا نے دلیلِ نبوت دی کہ خدا تعالیٰ ان کے ساتھ ایک فرماں بردار جماعت کر دیتا ہے۔

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

اداریہ

انصاف کرو ورنہ یاد رکھنا؟

ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں قرآن کا مؤمن
اقبال تیرے دیس کا کیا حال سناؤں

انصاف کرو ورنہ یاد رکھنا حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے قاتل صرف نو افراد تھے مگر غرق، تباہ پوری قوم ہوگئی تھی۔ کیونکہ باقیوں کا جرم خاموش رہنا تھا۔ سورۃ الاعراف آیت:74 کی تفسیر ہے کہ ''نَاقَۃُ اللّٰہ'' سے مراد حضرت صالح علیہ السلام کی وہ اونٹنی ہے جس پر سوار ہوکر وہ قوم کو رسالت کا پیغام پہنچایا کرتے تھے۔ جب بعض بدبخت سرداروں نے اس ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں اور ان کا ذریعہ پیغام رسانی ختم کر دیا تو اس کے نتیجہ میں عذاب کے مستحق ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ 9 سردار تھے جنہوں نے اس بات پر اکٹھ کیا تھا۔ اس سورت کی اگلی آیات میں ہے کہ انہوں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور پس انہیں ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے رہ گئے۔ قرآنِ کریم میں متعدد بار واضح ثبوت دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس کا قانون اور اس کی طرف بھیجے گئے بندوں کی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑھ کر دو ظالم شخص ہیں ایک مفتری علی اللہ، دوم جو نبی کی باتوں اور اس کا انکار کرے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور اولیاء اللہ اور مؤمنین صادقین کی مسلسل بے حرمتی کی جارہی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تعلیم ہے کہ کسی انسان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے علاوہ ازیں سورت السجدہ آیت 23 میں فرمایا کہ وَمَنْ اَظْلَمُ۔ یعنی انبیاء اور ان کے نشانوں کے منکر اور ان سے اعراض کرنے والے سب سے بڑے ظالم ہیں اور خدا تعالیٰ ایسے قطع تعلق کرنے والوں کو ضرور سزا دے گا۔ دوسری آیت 22 میں فرمایا۔ دنیا میں اس لئے عذاب آتے ہیں تا لوگ ان بداعمالیوں سے باز آئیں جن میں وہ گرفتار ہیں۔ حالیہ دنوں میں ہمیں دو ایسے واقعات دیکھنے کو ملے جن میں صراحۃً اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ ایک تو صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاقہ کرک میں ہندوؤں کی عبادت گاہ کو جلا کر مسمار کر دیا گیا۔ دوسرا صوبہ بلوچستان کے علاقہ مچھ میں شیعہ ہزارہ برادری کے 11 افراد کو قتل کر دیا گیا اور یہ دونوں کام ہمارے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں انجام پائے۔ ہندوؤں کے مندر کو نذرِ آتش کرنے پر چیف جسٹس آف پاکستان نے ازخود نوٹس لیا اور اس واقعہ کی رپورٹ طلب کر لی ہے۔ یاد رہے یہ امن معاہدے اور سپریم کورٹ کے حکم کی خلاف ورزی تھی جو شرپسندوں نے کی۔ دوسرا واقعہ بلوچستان کے علاقہ مچھ میں ہزارہ برادری کی ہلاکت کا تھا۔ اس کی ذمہ داری شدت پسند تنظیم دولتِ اسلامیہ (داعش) نے قبول کی ہے۔ اس سے قبل بھی ان علاقوں میں کان کنوں کو اغوا کر کے قتل کیا جا چکا ہے۔ مذہبی اقلیت کا اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ نہیں اس سے قبل شیعہ مخالف تنظیم لشکرِ جھنگوی اور جیشِ اسلام نے بھی کئی ہزار شیعہ برادری کے افراد قتل کئے ہیں۔ انسانی حقوق کی ایک تنظیم کے مطابق گزشتہ دو دہائیوں کے دوران بلوچستان میں شیعہ ہزارہ برادری کے 3 ہزار افراد قتل ہو چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو تمام پاکستانی اقلیتیں اپنے آپ کو پاکستان میں غیر محفوظ تصور کر رہی ہیں جس کے باعث لاکھوں افراد بیرونِ ممالک ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

25 فی صد اقلیتوں کا یہ ملک ہے اور 75 فی صد اکثریتی برادری کے بنیاد پرستوں کے ذریعہ پائے جانے والے فرقہ وارانہ تشدد میں بے حساب افراد کا قتل اور اغوا ہوا، اور یہ توہینِ رسالت کے قانون کے غیر معمولی، اور غیر معیاری ثبوت کی بنیاد پر اور ناقص توہینِ رسالت کے قانون کے تحت افراد کو سزا دینے کے باعث بنتی ہے۔ اس کی سزا طویل مدتی جیل اور موت ہے۔ پاکستان میں توہینِ مذہب کے قوانین کے مطابق دینِ اسلام کی توہین کرنے والے کو سزا موت سنا سکتی ہے لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ

ان قوانین کو اقلیتی برادری کو ہی نشانہ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چند اسلامی تنظیموں کا قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس کا بخوبی علم ہے جو بنیاد پرست ہیں لیکن وہ بے بس اور تماشائی کی طرح رویہ اختیار کیے رہتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ پولیس کے علاوہ عدالتی نظام بھی بے بس نظر آتا ہے۔ ججز جن کا کام صرف انصاف کرنا ہے بلاخوف وخطر ایسے موقع پر وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور کان بھی۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کے اصول کی صراحۃً خلاف ورزی ہے۔ ایسی ریاست اور قوموں کے متعلق قرآنِ کریم میں ذکر آیا ہے کہ ایک دن ان تمام کو دنیا میں اور آخرت میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔

ان دونوں واقعات پر بیانات، تبصرے اور انصاف دینے کی باتیں حکمران جماعت، فوج اور عدالتوں کی طرف سے کئے جا رہے ہیں لیکن ماضی کی طرح انصاف ملنا مشکل ہے۔ پاکستان کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ پچھلی دو دہائیوں سے عیسائیوں اور احمدیوں کی عبادت گاہوں پر حملے اور ان کے افراد کو قتل کیا گیا۔ اور ان پر جھوٹے مقدمات قائم کئے گئے ہیں جن کو آج تک کوئی انصاف نہ ملا اور نہ ہی قاتل گرفتار ہوئے اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ عدالتیں بھی انصاف نہ کر سکیں۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم کی روشنی میں کہ جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے اور جو بیجو گے وہی نکلے گا۔ نیک اعمال کا نتیجہ نیک اور بد کا بدانجام ہے۔ یاد رکھیے خدا کے پاک لوگوں کو خدا سے نصرت آتی ہے۔ جب آتی ہے تو پھر عالم کو اِک عالم دکھاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ قوم روز بروز اخلاقی قدروں، انسانیت کی خدمت سے عاری، اسلامی تعلیمات سے دور اور دہشت گردی اور تنگ نظری کا شکار بنتی جا رہی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ قوم برائیوں کے دلدل میں پھنستی جا رہی ہے جس سے باہر نکلنا مشکل ہے اور آج ایک عام شہری بھی محفوظ دکھائی نہیں دیتا۔ قرآنی تعلیم ہے کہ جب کوئی ان کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو ان عقل کے بہروں کو اس کی پکار سنائی نہیں دیتی۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے مامور من اللہ، فرستادہ کی نافرمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ سورہ یٰسین آیت 31 میں فرمایا: ترجمہ: وائے حسرت بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا مگر وہ اس سے ٹھٹھا کرنے لگتے ہیں۔ جب ایک مضطر دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما لیتا ہے لیکن ہماری پوری قوم نے پچھلے سال مولانا طارق جمیل کی قیادت میں ملک میں پائی جانے والی تمام برائیوں سے توبہ اور آسمانی وباء سے دعا نجات بھی کروا دی لیکن پھر بھی ہم ان برائیوں سے پاک نہیں ہو پائے۔ ایک سال سے زائد عرصہ ہو چلا کرونا وباء دنیا سے جانے کا نام نہیں لے رہی بلکہ اس میں اضافہ اور کئی اور قسم کی وبائیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہ ایک انذار اور قوموں کے لئے تنبیہ، الارم ہے۔ خدا کی طرف سے اگر بنی نوع انسان نے آج اس کو نہ سمجھا تو پھر خدا کی تقدیر اپنا کام کرے گی۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہر ایک انسان کو خود اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ کچھ باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا ایک دوسرے سے محبت، پیار کریں، مدد کریں، ہر فرقہ کا احترام کریں اور امن کے ساتھ رہیں یہ بنیادی عنصر ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ نے انسانِ آدم کو زمین پر بھیجا ہے۔

''محبت سب سے نفرت کسی سے نہیں''

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم کی سورۃ یٰسین آیت 67 میں فرماتا ہے۔ قیامت کے دن انسان کی جواب طلبی ہوگی ہر انسان کے اعضاء بھی اپنے جرائم کا اقبال کریں گے۔

اِک نہ اِک دن پیش ہوگا تُو فنا کے سامنے
چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں انصاف کرنے، پیار محبت سے رہنے کی، ہماری کمزوریوں، برائیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

لفظ پاکستان کس نے تخلیق کیا؟؟؟

تحریر: عبدالبصیر تاجور

لفظ پاکستان کے حقیقی خالق کی بات کی جائے تو غالب کا شعر صورت احوال کی حقیقی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر، کھلا

تاریخ کے اوراق تین مختلف لوگوں کو لفظِ پاکستان کی تخلیق کا دعویٰ دار قرار دیتے ہیں جس سے معاملہ متنازع ہو جاتا ہے۔ یہ سرقہ یا توارد والا معاملہ بھی نہیں بلکہ نہایت اہم تاریخ دستاویز کے استناد کا معاملہ ہے۔ محض سنی سنائی کے زور پر کسی ایک دعوے دار کو خالق قرار دینا تاریخ کے تقاضوں کے ساتھ خیانت ہے۔ ہم من حیث القوم تحقیق سے جی چرانے والے لوگ ہیں۔ ہماری سہل انگاری نارفتہ راہوں کی تحقیق کی بہ جائے تقلید کو ترجیح دیتی ہے۔

شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

جن تین شخصیات کے حوالے سے لفظ پاکستان کی تخلیق کی دعویٰ داری کا معاملہ سامنے آیا ہے ان کے اسمائے گرامی ہیں، خواجہ عبدالرحیم، چودھری رحمت علی، سید غلام حسن کاظمی۔ تینوں موقر شخصیات کا مختصر سوانحی جائزہ لیتے ہوئے لفظِ پاکستان کے خالق حقیقی کا معما حل کرتے ہیں۔

سابق گورنر پنجاب خواجہ احمد طارق رحیم کے والد خواجہ عبدالرحیم لفظ پاکستان کی تخلیق کے حوالے سے پہلے دعویٰ دار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان کے مختصر سوانح کے آخر پر ان کے دعوٰی کی حقیقت پیش کی جائے گی۔ خواجہ عبدالرحیم پنجاب سے تعلق رکھنے والے آئی سی ایس افسر رہے ہیں۔ آئی سی ایس کی ٹریننگ کے لیے کچھ عرصہ ولایت بھی رہنا پڑتا تھا۔ اسی ٹریننگ کے سلسلے میں ہی خواجہ عبدالرحیم کی ملاقات چودھری رحمت علی سے ہوئی اور وہ کچھ عرصہ ان کے ساتھ ہم کمرہ بھی رہے جہاں پر ان کے تیسرے ساتھی صاحبزادہ شیخ محمد صادق منگرول ہوتے تھے۔ شیخ صادق منگرول کا تعلق بھی پنجاب ہی سے تھا۔ خواجہ عبدالرحیم مختلف انتظامی عہدوں پر پہلے حکومت برطانیہ اور تقسیم کے بعد حکومت پاکستان کے ماتحت کام کرتے رہے اور 5 نومبر 1974 اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ آپ کو میانی صاحب لاہور کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

تخلیق پاکستان کی دعویٰ داری اور اس کی حقیقت:

تخلیقِ لفظِ پاکستان کے حوالے سے خود انہوں نے اپنی زندگی میں 1970 میں ایوان نوائے وقت راولپنڈی میں ایک اجلاس میں بتایا تھا کہ لفظ پاکستان کے خالق وہ ہیں اور انہوں نے یہ لفظ پہلی مرتبہ خیبر یونین آف اسٹوڈنٹس کے ایک اجلاس میں استعمال کیا تھا۔ خواجہ عبدالرحیم کے خالق لفظ پاکستان ہونے کے حوالے سے تائیدی دعویٰ معروف ماہر لسانیات خالد احمد نے بھی اپنی کتاب 'دی برج آف ورڈز' میں بھی میں بھی کیا ہے۔ "دی برج آف ورڈز" کے مطابق پاکستان کا لفظ سب سے پہلے خواجہ عبدالرحیم نے تخلیق کیا تھا۔ اپنے دعویٰ کی تائید میں خالد احمد کا کہنا ہے کہ انہیں یہ بات سید افضل حسین کے صاحبزادے عظیم حسین نے بتائی تھی۔ خالد احمد کے مطابق عظیم حسین کا کہنا تھا جب خواجہ عبدالرحیم لندن میں مقیم تھے تو ایک دن سر اولف کیرو کی کتاب 'سوویت سلطنت' کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی نظریں ایک نقشے پر ٹک گئیں جس میں وسطی ایشیاء کی ایک ریاست کا نام قراقل پاک ستان تحریر تھا۔ یہیں سے انہوں نے لفظ پاکستان اخذ کیا۔ خالد احمد نے اس بات کی تصدیق کے لیے سر اولاف کیرو کی محولہ بالا کتاب تلاش کی۔ انہیں اس کتاب کا 1950ء کا ایڈیشن دستیاب ہوا۔ خالد احمد کہتے ہیں کہ اس کتاب میں وہ نقشا بھی موجود تھا اور اس نقشے میں وہ نام بھی موجود تھا۔ خواجہ صاحب نے اس انکشاف کا اظہار چوہدری رحمت علی کے سامنے کیا۔ چوہدری صاحب کو تحریک ملی اور انہوں نے 'ناؤ اور نیور' کے عنوان سے پمفلٹ شائع کر دیا اور پاک ستان کے نام سے الگ وطن قائم کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ خواجہ عبدالرحیم کے تخلیق کار ہونے کے حوالے سے تیسرا دعوی اشفاق بخاری کی کتاب چنار کلب فیصل آباد میں کیا ہے اور "دی برج آف ورڈز" والے الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں سوائے اس بات کے کہ انہوں نے اولف کیرو کی کتاب کا نام قراقل پاک ستان لکھا ہوا ہے۔ جہانگیر خان کرکٹر کے حوالے سے بھی انہوں نے اسی دعویٰ کی تصدیق کی ہے کہ چودھری رحمت علی نے یہ لفظ خواجہ عبدالرحیم سے سنا تھا۔ اسی سلسلے میں علامہ اقبال کے ساتھ ملاقات کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ اس واقعے کا تصویری ثبوت بھی موجود ہے مگر لفظ پاکستان کے حوالے سے کہی گئی باتیں زبانی کے درجے میں آتی ہیں۔

حقیقت کیا ہے:

تاریخی تفتیش کے مروجہ و مسلمہ اصولوں کی چھانی میں سے جب تینوں دعووں کو گزارا جائے تو تینوں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ خواجہ عبدالرحیم نے جو دعویٰ کیا اس کی تائید میں انہوں نے کوئی بھی تائیدی ثبوت پیش نہیں کیا اور نہ ہی تفصیل بتائی کہ خیبر یونین آف سٹوڈنٹس کے کس اجلاس میں، کس مقام پر اور کس ضمن میں انہوں نے لفظ پاکستان کا استعمال کیا۔ اس صورت حال میں ان کے دعویٰ کا مسلم الثبوت ہونا اندھے کی گواہی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ خالد احمد ایک ماہر لسانیات تو تسلیم کیے جا سکتے ہیں مگر تحقیق و

تفتیش کے تقاضوں سے قطعاً نابلد ہیں۔ ان کی کتاب وینگرڈ پبلشرز نے 2001 میں شائع کی۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے جس کتاب "سوویت سلطنت" کا ذکر کیا ہے کہ جسے پڑھتے ہوئے خواجہ عبدالرحیم کو 1932 میں پاکستان کا نام ذہن میں سوجھ گیا تھا وہ کتاب 1932 میں چھپی ہی نہیں تھی۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو یا ہنسی آئے مگر یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ سر اولف کیرو کی کتاب سوویت ایمپائر کا پہلا ایڈیشن 1953 میں شائع ہوا تھا جب پاکستان کو بنے ہوئے بھی 6 سال ہو چکے تھے۔ کتاب کے پبلشر کا نام میک ملن اینڈ کمپنی تھا اور مذکورہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1967 میں شائع ہوا تھا۔ اور اس سے بھی مضحکہ خیز بات جو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ مصنف اصول تحقیق سے کلیتاً ناآشنا ہے کہ انہوں نے قاراقلپق کو ترکی زبان کا لفظ قرار دیا ہے اور قراقل پاک لکھا ہے۔ مصنف کو ترکک لفظ کی وجہ سے تسامح ہوا ہے۔ ترکک ان پینتیس عدد زبانوں کے اس گروہ کو کہا جاتا ہے جو دریائے آمو کے پار سے لے کر ایشیائے کوچک کے درمیان بولی جاتی ہیں۔ یہ لفظ بھی قراقل پاک کی بہ جائے دو لفظوں قارا اور قلپق کا مرکب ہے۔ مقامی یا ازبک تلفظ قورا گول پستان بنتا ہے۔ اسی طرح اشفاق بخاری نے تو تاریخ کا قیمہ کرتے ہوئے سر اولف کیرو کی کتاب کا نام ہی قراقل پاک لکھ مارا ہے اور اسی کو لفظ پاکستان کی وجہ تسمیہ بھی قرار دے کر کسی انجانی مجبوری کے تحت سہرا خواجہ عبدالرحیم کے سر منڈھنے کی بے سرو پا کوشش کی ہے۔ جو کتاب ہی 1953 میں سوویت ایمپائر کے نام سے پہلی مرتبہ چھپی اشفاق بخاری نے بنا کسی تحقیق کے مکھی پر مکھی مارتے ہوئے اسے 1930 سے پہلے کی قرار دیا ہے۔ یہ تو ویسا ہی کہ ایک چرسی قبرستان میں بھنگ کے سوٹے لگا رہا تھا۔ اچانک پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ چرسی کو ہڑبڑاہٹ میں اور کچھ نہ سوجھا تو ایک قبر سے لپٹ کر رونے گیا۔ ایک سپاہی نے ڈپٹ کر پوچھا کہ یہاں کیا کر رہے تو اس نے کہا والد کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہا ہوں۔ سپاہی نے نشان دہی کی کہ قبر تو بہت چھوٹی ہے، کسی آٹھ نو سال کے بچے کی لگتی ہے تو چرسی کا جواب آج تک تاریخ نے محفوظ رکھا ہے کہ میرے والد کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ خواجہ عبدالرحیم استعداد والے شخص تھے۔ آئی سی ایس افسر ہونا ان کی لیاقت کی مبینہ دلیل ہے۔ عین ممکن ہے کہ چودھری رحمت علی نے انہی کے توسط سے لفظ پاکستان سنا ہو مگر یہ تمام زبانی باتیں ہیں۔ ان کو کسی بھی صورت میں استناد کا درجہ نہیں دیا سکتا۔ تائید میں لکھی گئی دونوں مذکورہ بالا کتب کی اشاعت اکیسویں صدی میں ہوئی ہے۔ 1997 میں خواجہ عبدالرحیم کے بیٹے کا گورنر پنجاب ہونا بھی اسی سلسلے کی ایک طاقت ور کڑی ہے۔ یہ الگ بات غالباً فرمائش پہ تاریخ کا قیمہ کرتے ہوئے مصنفین کرام نے اس نکتے پر غور نہ کیا کہ گوگل جیسے "علامہ کل" کا دور دورہ ہوگا اور ایک کلک پر سارے تاریخی جھول اور لیپا پوتیاں سامنے آ جائیں گی۔ اور یہ بات بھی مدنظر رہے کہ خواجہ عبدالرحیم کی بابت 1932 کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ لفظ پاکستان انہوں نے اولف کیرو کی کتاب سے اخذ کر کے چودھری رحمت علی کے کانوں میں ڈالا۔ لہٰذا اس تمام معاملے کی مکمل تحقیق پیش کر دی جاتی ہے۔

اب آتے ہیں تخلیق پاکستان کے دوسرے دعویٰ دار چودھری رحمت علی کی طرف۔ دوسرے دونوں دعوے داروں کی نسبت چودھری رحمت علی کے نام بحیثیت خالق لفظِ پاکستان زیادہ گونجتا رہا۔ اس کی دوسری وجہ ان کی پمفلٹ ناؤ آر نیور یقینا ہوگا مگر پہلی بڑی وجہ ایک بڑے برصغیری قبیلے کا فرد ہونا ہے۔ چودھری رحمت علی 16 نومبر 1897 کو پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کی تعلیم اینگلو سنسکرت ہائی اسکول جالندھر سے حاصل کرنے کے بعد 1918 میں لاہور اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔ محمد دین فوق کے اخبار کشمیر گزٹ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے پیشہ ورانہ کیریئر کا آغاز کیا۔ 1928ء میں ایچی سن کالج میں اتالیق بھی مقرر ہوئے۔ 1930 کے اواخر میں انگلستان چلے گئے اور جنوری 1931ء میں انھوں نے کیمبرج کے کالج ایمنویل میں شعبہ قانون میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لیا۔ کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں سے قانون اور سیاست میں ڈگریاں حاصل کیں۔۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنا مشہور پمفلٹ (Now or Never) (اب یا کبھی نہیں) شائع کیا جس میں لفظ "پاک ستان" استعمال کیا گیا۔ اسی پمفلٹ کی بنیاد پر رحمت علی لفظ پاکستان کی تخلیق کے دعویٰ دار ہیں۔ اس کے بعد برصغیر کے طلبہ پر مشتمل ایک تنظیم پاکستان نیشنل لبریشن موومنٹ کے نام سے قائم کی۔ انہوں نے پاک ستان، بنگلستان اور عثمانستان کے نام سے تین الگ مسلمان ممالک کا نقشا بھی پیش کیا۔ ان کے نقشے والے پاک ستان میں کشمیر، پنجاب دہلی سمیت، سرحد، بلوچستان اور سندھ شامل تھے۔ جبکہ بنگلستان میں بنگال، بہار اور آسام کے علاقے تھے اس کے علاوہ ریاست دکن کو عثمانستان کا نام دیا۔ انہوں نے انگلستان میں رہ کر قیام پاکستان کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی اور اپنے مقصد کے ابلاغ کے لیے پمفلٹس کی تقسیم کا مہذب راستہ اختیار کیا۔ رحمت علی قرارداد لاہور کے تاریخی جلسے کا حصہ نہیں تھے۔ پاکستان کا قیام ان کے نقشے کے مطابق نہ ہو سکا تھا لہٰذا تین بڑے ممالک کی جگہ ایک چھوٹا سا پاکستان لینے پر جناح پر برہم تھے اور انہیں قائداعظم کی بجائے مشہور نارویجن غدار ابراہام قوئزلنگ کے نام پر قوئزلنگ اعظم کہتے تھے۔ یاد رہے کہ قوئزلنگ نے اپنی قوم کا ساتھ دینے کی بجائے نازیوں کا ساتھ دیا اور نازیوں کا نمائندہ بن کر اپنی قوم پر حکمرانی کی۔ قیام پاکستان کے بعد رحمت علی دو مرتبہ پاکستان آئے مگر نامساعد حالات کی وجہ سے واپس انگلستان جا کر رہنے کو ترجیح دی۔ تین ممالک کی بجائے ایک چھوٹا سا پاکستان حاصل کر لینا ان کے خواب کی تعبیر نہ تھا اور وہ اس پر نہایت دلبرداشتہ تھے۔ انگلستان میں آپ 114 ہیری ہٹن روڈ پر رہائش پذیر تھے۔ زندگی کے آخری ایام قسم پرسی میں گزرے۔ 3 فروری 1951 کو ایولائن نرسنگ ہوم میں وفات پائی۔ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ 17 روز تک کولڈ اسٹوریج میں ان کا بے جان لاشہ دیار غیر میں لاوارث پڑا رہا۔ رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم کا معاملہ بھی یوں ہوا کہ اٹھارہویں روز پاکستانیوں کی

بجائے دو مصری طلبہ نے 20 فروری، 1951ء کو ان کی تکفین کر دی۔ تکفین و تدفین کے دو سو پونڈ کا قرض تحریک پاکستان کے اس رہنما کی لاش پر رہا اور انہیں کیمبرج کے قبرستان کی قبر نمبر بی-8330 میں لاوارث کے طور پر امانتاً دفن کر دیا گیا۔

حقیقت:

یہ ناقابل تردید دستاویزی حقیقت ہے کہ 28 جنوری 1933ء کو 3 ہمبر اسٹون روڈ، کیمبرج سے شائع ہونے والے پمفلٹ میں چودھری رحمت علی نے پاکستان کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اسی بنیاد رحمت علی کو لفظ پاکستان کی تخلیق کاری کا دعوی تھا۔ اب یہ لفظ خود ان کی اپنی ذہنی اختراع تھا یا خواجہ عبدالرحیم نے ان کے کان میں ڈالا، دستاویزی ثبوت بہر حال چودھری رحمت علی کے حق میں ہے۔ اس سلسلے میں دو پہلو نہایت قابل اعتنا ہیں۔ چودھری رحمت علی نے پاکستان کی بہ جائے پاک ستان کا لفظ پیش کیا تھا اور دوسرا پہلو یہ کہ لفظ پاک ستان کی پیشکاری میں محمد اسلم خان خٹک صاحبزادہ شیخ محمد صادق منگزول، اور عنایت علی خان بھی برابر کے شریک تھے کیوں کہ پمفلٹ ان چاروں کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا۔ لفظ پاک ستان کے کریڈٹ سے دیگر تینوں اشخاص کو محروم رکھنا تاریخی خیانت ہو گی۔ چودھری رحمت علی پمفلٹ ناؤ آر نیور کے علاوہ ڈیوائن گائیڈنس کے بھی مصنف ہیں۔ لفظ پاکستان کی تخلیق کے تیسرے دعویٰ دار کا نام غلام حسن شاہ کاظمی ہے۔ سید غلام حسن کاظمی کا تعلق کشمیر کی سرزمین سے تھا۔ غلام حسن کاظمی 24 ستمبر 1905ء کو طوری شریف ضلع ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بارہ مولا سے حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے سید غلام حسن شاہ کاظمی لاہور چلے گئے۔ لاہور میں اپنے ماموں سید لعل حسین کاظمی کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ سید لعل حسین کاظمی انقلابی فطرت کے مالک تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انقلابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور اسی بنیاد پر ہزارہ بدر کر دیے گئے تھے۔ ان کا فارغ نہ بیٹھا جانا اور لاہور جا کر مولانا ظفر علی خان کے مشہور اخبار زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ حکومت کے خلاف سچ لکھنے پر لعل حسن کاظمی کو جیل ہوئی تو مولانا ظفر علی خان نے سید غلام حسن شاہ کاظمی کو زمیندار کی مجلس ادارت میں شامل کر لیا۔ بھانجا بھی ماموں کی روش پر قائم رہا۔ افغانستان میں انگریزوں کی پالیسیوں کے حوالے سے ایک اداریہ تحریر کیا اور حکومتِ وقت پر سخت تنقید کی۔ حکومت نے غلام حسن شاہ کاظمی کو بھی گرفتار کر لیا اور 2 سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ 1926-27 کا عرصہ مختلف جیلوں میں کاٹنے کے بعد رہائی ملی۔ رہائی کے بعد کچھ ماہ سری نگر میں ایک اخبار کی ادارت کی۔ ایک سخت اداریہ لکھنے کی پاداش میں سری نگر بھی چھوڑنا پڑا اور بمبئی کی راہ لی۔ وہاں ایک ناشر مظفری اینڈ کمپنی، تاجران کتب، بھنڈی بازار کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا۔ مختلف تجربات کے بعد ان کے دل میں اپنا ہفت روزہ یا ماہنامہ نکالنے کی جوت بھی تھی اور سری نگر یا ایبٹ آباد دو الگ ترجیحات بھی تھیں۔ سری نگر کا آپشن اس لیے ترک کرنا پڑا کہ مہاراجہ نے پہلے بھی ان پر پابندی لگائی تھی۔ ان کو ایبٹ آباد ہی بچتا تھا انہوں نے یکم جولائی 1928ء کو اپنے ایک تعلق دار عزیز چشتی کے توسط سے ایبٹ آباد سے پاکستان نام کے ایک ہفت روزہ اخبار کے اجراء کے لیے ڈیکلیریشن کی درخواست دی۔ درخواست ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے مسترد کرتے ہوئے ریمارکس کے ساتھ واپس کر دی۔ 'درخواست گزار کو مطلع کیا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ ابھی مزید تفتیش اور تحقیق کا متقاضی ہے۔ جونہی اس درخواست پر کوئی فیصلہ ہوا، درخواست گزار کو مطلع کر دیا جائے گا۔' 21 مئی 1929ء کو غلام حسن شاہ کے بھائی سید میران شاہ نے ایک مکتوب کے ذریعے غلام حسن شاہ کو مطلع کر دیا کہ پاکستان اخبار کے اجرا کی منظوری نہیں مل سکی۔ مایوس ہونے کی بجائے غلام حسن کاظمی نے ڈیکلیریشن کے لیے کوشش جاری رکھی۔ 1935ء میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے ایک نئی امید کے ساتھ انہوں نے بعد ایک مرتبہ پھر ہفت روزہ پاکستان کے اجراء کی درخواست داخل کر دی۔ اس مرتبہ وہ کامیاب رہے اور یوں یکم مئی 1936ء کو ایبٹ آباد سے ہفت روزہ پاکستان کی اشاعت کا آغاز ہو گیا۔ ہفت روزہ پاکستان نے بہت کم زندگی پائی۔ دو سال بعد اس اخبار کو وزیر اعلیٰ سرحد ڈاکٹر خان نے بند کر دیا۔ آخر پر مظفر آباد کے ایک نواحی موضع ٹھنگر شریف میں جا بسے اور تصنیف و تالیف میں جت گئے۔ ہندوستان بھر کے چوٹی کے ہم عصر مشاہیر کے ساتھ آپ کا مراسلت کا نہایت توانا سلسلہ تھا۔ بہت سی زبانوں پر عبور رکھنے کے علاوہ آپ نے متفرق و متنوع موضوعات پر بہت سی کتب بھی لکھیں اور 14 ستمبر 1984ء کو انتقال کیا اور ٹھنگر شریف میں ہی دفن ہوئے۔

حقیقت:

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا لفظ سب سے پہلے غلام حسن شاہ کاظمی نے ہی استعمال کیا۔ اگرچہ یہ لفظ ایک ہفت روزے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور بعض محققین کے نزدیک اغلب امکان اس بات کا بھی ہے کہ چودھری رحمت علی نے خواجہ عبدالرحیم سے سننے کی بجائے غلام حسن شاہ کاظمی یا ان کے کسی عزیز کے توسط سے سنا اور اسے پانچ سال بعد اپنے پمفلٹ کا حصہ بنایا کیونکہ اس عرصے میں چودھری رحمت علی بھی ہندوستان میں ہی مقیم تھے۔ یہ امکان قرین قیاس نہیں لگتا کیوں کہ چودھری رحمت علی کا ایبٹ آباد آنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور اس سے بھی بڑھ یا توانا اور ناقابل تردید حقیقت اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ چودھری رحمت علی نے سید غلام حسن کاظمی کے پانچ سال بعد بھی اپنے پمفلٹ میں لفظ پاکستان PAKISTAN نہیں بل کہ لفظ پاک ستان PAKSTAN استعمال کیا تھا۔ ان کا پمفلٹ آج بھی موجود ہے اور سرکاری ریکارڈ کا حصہ ہے۔ اسی طرح میران شاہ 21 مئی 1929 کا خط آج بھی موجود ہے جو واضح کر دیتا ہے کہ چودھری رحمت علی کے پاک ستان کے مقابلے میں سید غلام حسن شاہ کاظمی نے پاکستان کا لفظ پانچ سال پہلے تخلیق اور پیش کیا تھا۔

تصویری ریکارڈ اور ثبوت پیش خدمت ہیں۔ ثبوت ہائے متونی بھی موجود ہیں۔ کسی کو اگر معلومات درکار ہوں ہوں تو رابطہ کر سکتا ہے۔

چلی کے کانکن اور ہمارے مقامی چاہ کن

تحریر: وجاہت مسعود

قریب چالیس برس اپنے ملک کی تاریخ اور سیاست کی خاک چھاننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری قوم کی بیشتر مشکلات کی وجہ ہماری اجتماعی سیاسی ناخواندگی ہے۔ تدریسی اعتبار سے ناخواندہ غریبوں پر الزام دھرنا قطعاً ناواجب ہے۔ اس ملک کے دس کروڑ شہری دانستہ ان پڑھ رکھے گئے ہیں۔ رسمی تعلیم سے یہ محرومی ان کی مستقل غربت، محکومی اور لاچارگی کو یقینی بناتی ہے۔ کل 27 فیصد آبادی میٹرک پاس ہے۔ سکول کی سطح پر اساتذہ کی کمزور ذہنی استعداد، تعلیمی سہولیات کے فقدان اور نصاب میں من گھڑت بیانات کی مجرمانہ تلقین نے ایسا نسخہ تیار کیا ہے کہ دس بارہ برس کی یہ تعلیمی مشق بے معنی ہے۔ اسکول میں نیم خواندہ اساتذہ کے ہاتھوں جسمانی تشدد، ناپختہ تمدنی خیالات اور ناتراشیدہ شخصی رویوں کی ترشول پر مصلوب طالب علم میٹرک پاس بھی کر لے تو اس کے لئے روزگار کا کوئی امکان ہے اور نہ معاشرے میں مفید کردار ادا کرنے کا موقع۔ پندرہ کروڑ مطلق ناخواندہ اور نیم خواندہ افراد کا یہ لشکر ٹیلی وژن پر ہر شام دھاڑتے تجزیہ کاروں کے رحم و کرم پر ہے۔ طرہ یہ کہ حقیقی بحران تو کالج سے شروع ہوتا ہے۔ 18 سے 24 برس تک کی دو کروڑ آبادی میں سے کالج تک رسائی پانے والوں کی کل تعداد تیس لاکھ ہے گویا متعلقہ عمر کے بمشکل 15 فیصد بچے کالج کی تعلیم پا رہے ہیں۔ اور تعلیم بھی ایسی کہ سماجی علوم میں تنقیدی درک پیدا ہوتا ہے اور نہ سائنسی فکر مرتب ہوتی ہے۔ میرے مشاہدے میں کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اساتذہ کی اکثریت کا معیار ایسا ہے کہ ہمیں کسی دشمن کی ضرورت نہیں، ہم اپنی اعلیٰ درس گاہوں میں قوم کا قبرستان تیار کر رہے ہیں۔ یہ کیسی تعلیم ہے جو ہمیں بیرونی دنیا میں اپنے ہم عصر طالب علموں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں بناتی۔ جس بچے میں ذہانت کی کرن پھوٹتی ہے، وہ لشٹم پشٹم یہ ملک چھوڑ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ملک کا معاشی، انتظامی اور سیاسی نظام اعلیٰ ذہانت کو جذب کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ یہاں سے سیاسی نوعیت کی بحث شروع ہوتی ہے۔ مغرب اور مشرق کی ان گنت اقوام عشروں پہلے سو فیصد خواندگی کا ہدف حاصل کر چکیں۔ آپ نے اپنے ملک میں تعلیم بالغاں کا لفظ آخری بار کب سنا تھا؟ گزشتہ چالیس برس میں ملکی آبادی آٹھ کروڑ سے 23 کروڑ کو جا پہنچی۔ آپ نے اپنے اردگرد کتنے نئے سرکاری پرائمری سکول تعمیر ہوتے دیکھے؟ نجی سکول بیوپار ہیں اور دستور کی شق 25 الف میں دی گئی ضمانت کے مکلف نہیں ہو سکتے۔ خواندگی نہیں تو معیاری تعلیم کا سوال کیسے اٹھایا جائے؟ 1972 سے تعلیمی بجٹ بتدریج کم ہوا ہے۔ 2009ء میں اعلان ہوا کہ 2015ء تک تعلیمی بجٹ جی ڈی پی کے 7 فیصد تک بڑھایا جائے گا۔ یہ شرح آج بھی 3.2 فیصد ہے۔

کسی سیاسی جماعت یا نام نہاد مقتدرہ کی ترجیح تعلیم نہیں۔ اس لئے کہ تعلیم بنیادی طور پر سیاسی سوال ہے۔ تعلیم قومی ترجیح بن جائے تو اقتدار کا موجودہ ڈھانچہ منہدم ہو جائے گا۔ اس ڈھانچے کے چار ستون ہیں۔ (1) بارسوخ خانوادے جن کی سیاست محض اپنے مقامی مفادات کا تحفظ ہے۔ یہ کسی اصولی یا دستوری سیاست سے تعلق نہیں رکھتے۔ ذات پات، قبیلے، عقیدے اور تھانے کی بنیاد پر انتخابی سیاست کرتے ہیں اور غیر جمہوری قوتوں کے آزمودہ ساتھی ہیں۔ (2) نچلی سطح پر مجرمانہ پس منظر رکھنے والے عناصر جو اپنے دھندے کے لئے انتظامیہ اور ریاستی اداروں کے دست نگر ہیں۔ (3) ریاستی اور آئینی اداروں کا نادیدہ گٹھ جوڑ جس میں بڑے کاروباری حلقے، مذہبی عناصر اور قلم فروش میڈیا مستقل حلیف ہیں۔ (4) قومی یا علاقائی سطح کی سیاسی جماعتیں اقتدار کے لئے دیگر تین دھڑوں کی محتاج ہیں۔ اس بساط پر سیاسی شعور رکھنے والا کارکن یا رہنما کمزور ترین بلکہ ناپسندیدہ کڑی ہے۔ اجتماعی ذمہ داری کے احساس سے مملو سیاسی شعور ہی جمہوری استحکام کی ضمانت دے سکتا ہے اور معیاری تعلیم کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ ہماری سیاسی ناخواندگی ہی کا کرشمہ ہے کہ ہم پالیسی کی بجائے نعرے، اعداد و شمار کی بجائے وعدے اور دلیل کی بجائے گالی کو سیاسی عمل سمجھتے ہیں اور پھر دھوکا دہی کا ماتم کرتے ہیں۔ بیرون ملک سے آنے والا ایک غیر منتخب مشیر ہزارہ غم زدگان سے پوچھتا ہے کہ وزیر اعظم کے آنے سے آپ کو کیا ملے گا؟ وزیر اعظم کی اپنے شہریوں کے دکھ میں شرکت اس عمرانی معاہدے کی توثیق ہوتی جس کی روشنی میں شہریوں نے ریاست کو اپنے تحفظ کی ذمہ داری سونپی ہے۔ 5 اگست 2010ء کو چلی کے ایک دور افتادہ علاقے Copiapó میں تانبے کی کان میں 33 کانکن سطح زمین سے 700 میٹر نیچے اور کان کے دہانے سے 5 میل اندر دب گئے۔ علاقہ ایسا کڈھب تھا کہ بازیابی بہت مشکل تھی۔ لیکن فوری طور پر تین اطراف سے سرنگیں کھودی جانے لگیں۔ چلی کا ارب پتی وزیر اعظم سباسٹین پنیرا خود موقع پر موجود تھا۔ 70 دن کی مشقت کے بعد 50 میل لمبی سرنگ کھود کر خصوصی ٹیوب کے ذریعے سب کانکن زندہ سلامت نکال لئے گئے۔ ہر کانکن کو سطح زمین تک لانے میں ایک گھنٹہ لگتا تھا۔ دنیا بھر میں کروڑوں افراد ٹیلی ویژن پر یہ معجزہ دیکھ رہے تھے۔ شفٹ کا لیڈر سب سے آخر میں باہر آیا اور اپنے وزیر اعظم سے ہاتھ ملا کر کہا، میں اپنی امانت میں دیے گئے سب کانکن بچا لایا ہوں۔ جذباتی وزیر اعظم نے جواب دیا، 'آج سے ہمارا ملک چلی تبدیل ہو گیا ہے'۔ چلی میں کانکنوں کو حادثہ پیش آیا تھا۔ مچھ میں کانکن قتل کیے گئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ساری توجہ لواحقین کے دھرنے پر ہے، کسی نے وقوعے کی تحقیقات، قاتلوں کی نشاندہی یا گرفتاری کا سوال نہیں اٹھایا۔ وزیر اعظم کے کوئٹہ نہ جانے کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ وزیر اعظم قوم کے خلاف ریاست کا جرم جانتے ہیں۔ یہ کان کن اور چاہ کن کا فرق ہے۔ ♣♣※※

احترام انسانیت

تحریر: ابن قدسی

مُردوں کا احترام کرو کیونکہ ہر جان نے مُردہ ہونا ہے

خدا تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے حضرت انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ تمام دیگر مخلوقات کو انسانوں کی خدمت پر لگا دیا گیا ہے تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔ اعلیٰ ہونے کے باوجود دوسرے جانداروں کی طرح انسانوں کو بھی فنا کے قانون سے بالا نہیں رکھا جو وجود دنیا میں آیا ہے اس کی دنیاوی زندگی کو فنا مقدر ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ دنیا میں ایک وجود آتا ہے اپنی مقررہ زندگی کو گزارتا ہے اور یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کا آنا باعث مسرت ہوتا ہے تو جانا اپنوں کو رنجیدہ اور افسردہ کر دیتا ہے۔ جب کوئی وجود اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو معاشرتی طور پر فرض ہے اس کو ایک احترام دیا جائے۔ اس کے لئے مختلف مذاہب نے مختلف طریقہ ہائے احترام کی ہدایات دی ہیں لیکن احترام کا سب سے بہتر طبعی اور الہامی طریق وہ ہے جسے اسلام نے اپنایا اور فوت شدہ انسانوں کے جسد کو زمین میں دفنانے کی ہدایت دی۔ مردہ کو دفنانے کی یہ قدیم رسم اور وہ پہلی انسانی سوچ ہے جو تمثیلی زبان میں آدم کے دو بیٹوں کے واقعہ کی صورت میں انسانی علم کا حصہ بنی۔ آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ یہ ہے کہ جب ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو جس کی قربانی مقبول ہوئی تھی اور اس کی محنت عمدہ پھل لائی تھی محض حسد کے ہاتھوں مغلوب ہو کر قتل کر دیا تو جلد بعد وہ نادم ہوا اور اسے فکر دامنگیر ہوئی کہ وہ اپنے مقتول بھائی کی نعش کا کیا کرے اس پر اسے ایک نظارہ دکھایا گیا کہ ایک کوّے نے دوسرے کوّے کی نعش کو زمین میں گڑھا کھود کر دفن کیا ہے۔ اس پر اسے بھی یہ ترکیب سوجھی اور اس نے اپنے بھائی کی نعش کو زمین میں دفن کیا۔ بھائی کو قتل کرنے جیسا قبیح فعل کرنے کے باوجود بھائی کو قبر میں دفن کیا گویا بے شک وہ جانوروں سے بدتر ہو گیا۔ خدا تعالیٰ نے ایک پرندہ کے ذریعہ اسے یہ خلق سکھایا کہ تم اپنے بھائی کو دفن کرنا ہے۔ پھر بھی مردے کو احترام لازماً دینا ہے۔ یہی وجہ سے ہر مذہب، ہر تہذیب میں مردوں کا ادب واحترام پایا جاتا ہے۔ تدفین کے طریق کار میں فرق بلکہ اختلاف تک ہو سکتا ہے مگر کسی معاشرہ میں یہ بات نہیں پائی جاتی ہے کہ ہم اپنے مردوں کو ذلیل کرتے ہیں بلکہ ہر ایک اپنی سوچ کے مطابق انہیں پورا اعزاز دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے احترام میت کے معاملے کو مذہب سے بالا ہو کر صرف انسانیت کے پیمانے پر رکھا ہے۔

حدیثوں میں ذکر ہے کہ: * مر علی رسول اللہ ﷺ بجنازۃ فقام فقیل لہ انہ یھودی فقال أليست نفساً۔

(سنن نسائی۔ کتاب الجنائز باب القیام الجنازۃ اھل الشرک)

کہ ایک دفعہ حضور ﷺ تشریف فرما تھے کہ ایک جنازہ گزرا۔ آپ ﷺ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ہوا، انسان تو ہے۔

گویا انسانیت کا احترام آپ ﷺ کو اس حد تک تھا کہ آپ ﷺ کسی جنازے کے احترام کے لئے بھی کھڑے ہو جاتے تھے۔

* جنگ احزاب میں ایک کافر سردار خندق میں گر کر ہلاک ہو گیا اور نعش پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ کفار نے پیشکش کی کہ دس ہزار درھم لے لیں اور یہ نعش ان کے حوالے کر دی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہم مردہ فروش نہیں، ہم اس کی دیت نہیں لیں گے اور پھر بلا معاوضہ اس نعش کو واپس کر دیا۔ (شرح الامام العلامہ محمد بن عبدالباقی الزرقانی المالکی علی المواھب اللدنیۃ للعلامۃ القسطلانی۔ الجزء الثانی صفحہ ۱۱۴، الطبعۃ الاولیٰ بالمطبعۃ الازھریۃ المصریۃ) (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، الجزء الثالث صفحہ ۱۵۵، دار الجیل بیروت لبنان)

* اسی طرح حضور ﷺ کا یہ طرز عمل تھا کہ اگر میدانِ جنگ میں یا اس قسم کے حالات میں آپ ﷺ کو کوئی نعش پڑی ملتی تو آپ ﷺ اس کی تدفین کا حکم دیتے اور اسے اپنی نگرانی میں دفن کراتے اور یہ نہ پوچھتے کہ یہ مومن کی نعش ہے یا کافر کی۔

(السیرۃ الحلبیۃ۔ تالیف علی ابن برھان الدین الحلبی الشافعی۔ الجزء الثانی صفحہ ۱۹۰، مطبعۃ محمد علی صبیح واولادہ بمیدان الازھر بمصر ۱۹۳۵ء)

* جنگ بدر میں اور جنگ احد میں آپ ﷺ نے کفار کی نعشوں کی تدفین کروائی اور ایک ہی میدان میں مسلمانوں اور کافروں کی تدفین ہوئی، وقت کی تنگی کی وجہ سے جس طرح کئی مسلمان شہداء کو ایک ہی قبر میں دفن کروایا گیا اسی طرح کفار کی نعشوں کو بھی ایک ہی جگہ دفن کروایا۔

(السیرۃ الحلبیۃ۔ تالیف علی ابن برھان الدین الحلبی الشافعی۔ الجزء الثانی صفحہ ۱۹۰، مطبعۃ محمد علی صبیح واولادہ بمیدان الازھر بمصر ۱۹۳۵ء)

* حضور ﷺ کا حکم تھا کہ کسی مخالف کی نعش کا مثلہ نہ کیا جائے۔ اس سے صاف

معلوم ہوتا ہے کہ جو وحشت مذہب سے دور لوگوں میں پائی جاتی ہے آنحضور ﷺ مسلمانوں میں اس کو مٹانا چاہتے تھے۔ اور سب کو تہذیب کے دائرہ میں رکھنا آپ ﷺ کا منصب خاص تھا۔

اسی طرح بنو قریظہ کو جب ان کی سرکشی کی سزا دی گئی تو ان کی نعشوں کو خندقیں کھدوا کر دفن کیا گیا۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، الجزء الثالث صفحہ ۱۵۶، دار الجیل بیروت لبنان)

* آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد ابو طالب کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ارشاد فرمایا کہ آپ اپنے والد کی تجہیز و تکفین کریں اور غسل دیں پھر ان کو دفنائیں۔

(السیرۃ الحلبیۃ۔ تالیف علی ابن برھان الدین الحلبی الشافعی۔ الجزء الثانی صفحہ ۱۹۰، مطبعۃ محمد علی صبیح واولادہ بمیدان الازھر بمصر ۱۹۳۵ء)

احترام میت کے بارے میں جو اسلامی تعلیم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

لا تسبوا لأموات فانهم قد افضوا الى ما قدموا (المستدرک۔ کتاب الجنائز باب النهی عن سب المیت)

تم وفات یافتہ لوگوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ان سے برا سلوک نہ کرو کیونکہ وہ اپنے خدا کے حضور پہنچ چکے ہیں۔

خدا تعالیٰ جیسا چاہے گا ان سے سلوک کرے گا، تمہارے برا بھلا کہنے سے ان کا کچھ نہ بگڑے گا، تم صرف اپنی زبان ہی گندی کرو گے۔

*اسی طرح حضرت عمرہ بنت عبدالرحمن بیان کرتی ہیں کہ:

لعن رسول اللہ ﷺ المختفی و المختفیة یعنی نباش القبور

(موطا امام مالک، جنائز، باب ما جاء فی الاختفاء وھو النبش)

حضور ﷺ نے قبروں کو بد نیتی اور بے حرمتی کے طور پر اکھیڑنے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔

* اسی طرح ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ جو شخص کسی مردے کی قبر بد نیتی سے اکھیڑتا ہے تو اسے قطع ید کی سزا دی جائے کیونکہ وہ ایک میت کے گھر میں داخل ہوا ہے۔ (ابو داؤد کتاب الحدود باب فی قطع النباش)

* فقہاء نے بھی وضاحت کی ہے کہ مردوں کی بے حرمتی نہ کی جائے خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب بحر الرائق میں لکھا ہے کہ:

اگر قبر ننگی ہو جائے اور اس میں یہودی کی ہڈیاں نظر آ جائیں تو ان کی بے حرمتی نہ کی جائے کیونکہ ان ہڈیوں کی حرمت بھی وہی ہے جو مسلمانوں کی ہڈیوں کی ہے۔ نیز جب زندگی میں ان سے ظالمانہ سلوک کرنا اور ان کی بے حرمتی کرنا منع ہے تو ان کی وفات کے بعد بطریق اولی یہ ممانعت قائم ہے۔

(البحر الرائق شرح کنز الدقائق۔ الشیخ زین الدین الشھیر بابن نجیم الجزء الثانی صفحہ ۱۹۵۔ طبع فی المطبعۃ العربیۃ۔ لاہور)

* اسی طرح بدائع الصنائع میں لکھا ہے کہ:

توہین کی غرض سے قبر اکھیڑنا حرام ہے۔

(البحر الرائق شرح کنز الدقائق۔ الشیخ زین الدین الشھیر بابن نجیم الجزء الثانی صفحہ ۱۹۵۔ طبع فی المطبعۃ العربیۃ۔ لاہور)

احترام میت کے حوالے سے اس واضح تعلیم کی وجہ سے ابتدائے اسلام سے ہی میت کے معاملے میں کوئی لڑائی جھگڑا نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی اکٹھا قبرستان ہوتا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی تدفین اس قبرستان میں ہوئی جو مکہ کا پرانا حضور ﷺ کا خاندانی قبرستان تھا اور اس میں مکہ کے وہ لوگ بھی دفن ہوا کرتے تھے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہی جگہ بعد میں جنت المعلی کہلائی۔

الرحلۃ الحجازیۃ کے مصنف محمد اللبیب، مکہ کی تاریخ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

جنت المعلی مکی قبرستان ہے۔ اس میں حضرت خدیجہؓ کا مزار مبارک ہے۔ حضرت خدیجہؓ کی قبر کے پاس ہی مکہ کے سولہ سرداروں کی قبریں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ کی قبر کے پاس حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ کا مزار بھی ہے۔ قریب ہی ابو طالب کا مزار ہے۔ (الرحلۃ الحجازیہ صفحہ ۵۵، ۵۶)

اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک یہودیہ فوت ہوئی تو حضرت عمرؓ کی اجازت سے اس کی تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں ہوئی۔ (السنن الکبریٰ، کتاب الجنائز باب النصرانیۃ تموت وفی بطنھا ولد مسلم)

خلافت عباسیہ کے دور میں جب بغداد کی بنیاد رکھی گئی تو وہاں ایک پرانا مجوسیوں کا قبرستان تھا۔ اسی قبرستان میں مسلمانوں کی تدفین بھی ہوا کرتی تھی اور پہلی مسلمان خاتون جس کی اس قبرستان میں تدفین ہوئی وہ بانو قتہ تھی۔ نیز اس قبرستان میں بعد میں بڑے بڑے بزرگ مثلاً حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام محمد بن اسحاقؒ، حسن بن زید، ہشام بن عروہ اور خیزدان دفن ہوئے۔ اس طرح بعد میں یہ مسلمانوں کا قبرستان بن گیا۔ (تاریخ بغداد او مدینۃ السلام۔ حافظ ابو بکر احمد بن علی الخطیب البغدادی۔ الجزء

الاول۔صفحہ ۱۲۵۔دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان)

انگلستان اور یورپ میں جو مسلمان فوت ہوتے ہیں بالعموم ان کی تدفین ایسے ہی قبرستان میں ہوتی ہے جن میں عیسائی بھی دفن ہوتے ہیں۔اس پر نہ کبھی عیسائیوں نے اعتراض کیا اور نہ مسلمانوں نے۔

مُردوں کی بے حرمتی کی تاریخ

اسلام اس اعلیٰ اور ارفع تعلیم کے باوجود ہمیں ایسی تاریخ مل جاتی ہے جہاں مسلمانوں اس پیاری تعلیم کو بالاطاق رکھ کر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے میتیوں کی بے حرمتی کو روا رکھا۔وحشت اور بربریت کے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ انسانی عقل سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ یہ کون سی اانسانیت ہے۔قبروں،مُردوں اور نعشوں کی بے حرمتی کرنے والے کیوں بھول جاتے ہیں کہ کل کو ان کا وجود بھی مُردوں میں شامل ہوگا۔اس وقت وہ خود اپنی حالت سے بے خبر ہونگے تو کہیں ایسا نہ کہ ان کے ساتھ بھی کوئی وہی سلوک نہ ہو جو آج وہ ان مُردوں سے روا رکھ رہے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نعش مبارک کی بے حرمتی

وحشت اور بربریت کا پہلا واقعہ جو تاریخ نے محفوظ کیا ہے وہ شہید مظلوم حضرت عثمانؓ کی نعش کی بے حرمتی کا ہے جو جاہل اور غصے سے بے قابو ہونے والے مصر اور دوسرے علاقوں کے جتھوں میں شامل نومسلموں کی طرف سے وقوع پذیر ہوئی۔ روایات میں آتا ہے:

نبذ عثمان رضی اللہ عنہ ثلاثة أيام لا يدفن، ثم ان حكم بن حزام القرشي ثم أحد بني أسد بن عبدالعزى، و جبير بن مطعم بن عدى بن نوفل بن عبد مناف، كلما علياً في دفنه، وطلبا اليه أن يأذن لأهله في ذالك، ففعل، و أذن لهم علي، فلما سمع بذلك قعدوا له في الطريق بالحجارة، و خرج به ناس يسير من أهله، و هم يريدون به حائطاً بالمدينة، يقال له: حش كوكب، كانت اليهود تدفن فيه موتاهم، فلما خرج به على الناس رجموا سريره، و هموا بطرحه، فبلغ ذالك عليا، فأرسل اليهم يعزم عليهم ليكفن عنه، ففعلوا، فانطلق حتى دفن رضى الله عنه في حش كوكب، فلما ظهر معاوية بن أبي سفيان على الناس أمر بهدم ذالك الحائط حتى أفضى به الى البقيع، فأمر الناس أن يدفنوا موتاهم حول قبره حتى اتصل ذالك بمقابر المسلمين۔

(تاریخ الامم والملوک للطبری، الجزء الثانی صفحہ ۶۸۷، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان)

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو تین دن تک شر پسندوں نے دفن کرنے میں رکاوٹ ڈالی۔آخر تین دن کے بعد مدینہ کے کچھ بااثر لوگوں نے جن میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے،حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دفنانے کے بارے میں بات چیت کی اور یہ بھی درخواست کی کہ آپ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھی اس میں مدد کے لئے کہیں۔جب شر پسندوں کو اس بات کا علم ہوا تو وہ راستہ میں پتھر لے کر بیٹھ گئے اور جنازہ گزرنے پر اس پر پتھراؤ کیا۔مدینہ میں ایک احاطہ تھا جس کا نام حش کوکب تھا اور یہودی اس میں دفن ہوتے تھے۔چونکہ جنت البقیع میں شر پسند حضرت عثمانؓ کے جسد مبارک کو دفن نہیں ہونے دیتے تھے اس لئے آپ کی نعش کو حش کوکب میں دفنانے کا پروگرام بنایا گیا۔اور رات کے وقت آپ کی تدفین کی گئی۔یہ احاطہ جنت البقیع سے کچھ فاصلے پر تھا۔جب امیر معاویہ خلیفہ بنے تو انہوں نے احاطہ کی دیوار گرانے کا حکم دیا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے مردوں کو اس خالی جگہ میں دفن کریں تاکہ یہ جگہ مسلمانوں کے قبرستان یعنی جنت البقیع میں شامل ہو جائے۔

نعشوں کی بے حرمتی کے دیگر واقعات

اس کے بعد شہید مظلوم حضرت امام حسینؓ کی نعش مبارک کی بے حرمتی کا واقعہ آتا ہے۔ان کا سرِ مبارک کاٹ کر یزید کے دربار میں پیش کیا گیا اور باقی جسم مبارک کربلا میں ہی رہا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی تدفین قسطنطنیہ کی فصیل کے قریب ہوئی۔عیسائیوں نے آپؓ کے مزار کی بے حرمتی کا ارادہ کیا تو بنوامیہ کے خلیفہ نے ان کو دھمکی دی کہ اگر تم نے ہمارے صحابیؓ کی قبر کی بے حرمتی کی تو ہم اس کا سختی سے انتقام لیں گے۔اس ڈر سے وہ اس کام سے رک گئے۔

(أسد الغابة فی معرفة الصحابة۔ابن الأثیر۔المجلد الخامس صفحہ ۱۴۳۔دار احیاء التراث العربی بیروت لبنان)

پھر جب عباسی دور آیا تو عباسیوں کے پہلے خلیفہ ابوالعباس سفاح نے اموی خلفاء کی قبروں کو اکھیڑا اور ان کی نعشوں کی بے حرمتی کی۔ہشام بن عبدالملک جس کی نعش صحیح و سالم تھی اس کو نکلوایا۔پہلے اس کو کوڑے لگوائے پھر سولی پر لٹکایا پھر اس کو جلا دیا۔

(الکامل فی التاریخ،ابن اثیر،المجلد الخامس۔دارالکتب العلمیۃ بیروت لبنان)

سپین میں عیسائیوں نے غلبہ پانے کے بعد مسلمانوں کے قبرستانوں کی سخت بے حرمتی کی۔اسی طرح یہودیوں کے قبرستانوں کو بھی نہ بخشا گیا۔

تاریخی واقعہ ہے کہ بعض عناصر نے سازش کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزار مبارک کی بے حرمتی کی جائے لیکن اس زمانہ کے مشہور مسلمان بادشاہ نورالدین

زنگی کو خواب میں بتایا گیا کہ کچھ بدبخت حضور ﷺ کے مزار مبارک کی بے حرمتی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس عادل بادشاہ نے مدینہ میں آ کر خواب کی تعبیر کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ دو عیسائی روضۂ مبارک سے کچھ فاصلے پر رہائش پذیر ہیں اور وہ سرنگ لگا کر حضور ﷺ کے جسد مبارک کی بے حرمتی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان عیسائیوں کو حسب جرم سزا دی گئی اور پھر حضور ﷺ کے مزار مبارک کے اردگرد تانبا اور سیسہ پگھلا کر ایسا پختہ انتظام کر دیا گیا کہ آئندہ کوئی بدبخت آپ ﷺ کے مزار مبارک تک نہ پہنچ سکے۔

(وفاء الوفا بأخبار دار المصطفی ﷺ۔ تالیف نور الدین علی الشافعی السمہودی۔ الجزء الاول صفحہ ۴۶۶۔ بمطبعۃ الآداب والمؤید بمصر)

مشہور سکھ لیڈر بندہ بیراگی نے سرہند شریف کے قبرستانوں کی بے حرمتی کی، قبریں کھول کر نعشیں نکالیں ان سے وحشیانہ سلوک کیا اور ہڈیوں کو نذر آتش کر دیا۔ (سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں صفحہ ۱۵۷۔ از ابوالامان امرتسری)

انگریزوں کا جب سوڈان پر تسلط ہوا تو انہوں نے مہدی سوڈانی کی نعش کو قبر سے نکالا، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور دریا میں بہا دیا اس طرح دوسرے مسلمانوں کی نعشوں کی بھی بے حرمتی کی۔

(آئمہ تلبیس یا غارتگرانِ ایمان مؤلفہ ابوالقاسم رفیق ذلاوری صفحہ ۴۵۳۔ مطبعہ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور۔ جنوری ۱۹۳۷ء)

انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو لاہور میں مسلمانوں کے کئی مقبروں کو نیلام کرا دیا جنہیں گرا کر لوگوں نے مکانوں اور کوٹھیوں میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جو علاقے آج کل گوالمنڈی، ہال روڈ اور انارکلی کہلاتے ہیں یہ کسی زمانہ میں قبرستان تھے اور پھر ان کو ہموار کر کے یہاں آبادی بسائی گئی۔

غرض اسلام ہمارے سامنے احترام آدمیت کی جو تعلیم دیتا ہے اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو معاشرے میں موجود کئی قسم کی بے چینیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ تاریخ واقعات کو محفوظ رکھتی ہے آئندہ آنے والی نسلوں تاریخ میں موجود ان واقعات کو پڑھ کر ایک طرف بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف شرمندگی اور ندامت محسوس کرتی ہے۔ اس لیے مُردوں کا احترام قائم رکھا جائے کیونکہ ہر ایک نے مُردہ ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے"، لاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

شعبہ پاکستان

کیا عمران خان جنرل باجوہ سے کچھ سیکھ سکتے ہیں؟

تحریر: سید مجاہد علی

وزیر اعظم عمران خان نے متعدد ٹویٹ پیغامات میں براڈ شیٹ کمپنی کے سربراہ کاوے موساوی کے ایک یوٹیوب انٹرویو کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ اس سے ملکی اشرافیہ کی لوٹ مار کا دستاویزی ثبوت سامنے آ گیا ہے۔ واضح رہے یہ وہی کمپنی ہے جسے برطانوی ہائی کورٹ کے حکم پر سفارت خانہ پاکستان کے اکاؤنٹ سے زبردستی 28 اعشاریہ 7 ملین ڈالر یعنی ساڑھے چار ارب روپے سے زیادہ رقم ادا کروائی گئی تھی۔

کاوے موساوی کی کمپنی بدستور پاکستان احتساب بیورو سے سود کی مد میں مزید تین ملین ڈالر کا تقاضا کر رہی ہے۔ برطانوی عدالت نے یہ ادائیگی سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں براڈ شیٹ اور نیب کے درمیان ایک معاہدہ کی مد میں کرنے کا حکم دیا تھا۔ معاہدہ کے تحت کمپنی کو شریف خاندان کے علاوہ متعدد دوسرے پاکستانیوں کے بیرون ملک اثاثوں کا سراغ لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔ تاہم نیب شاید براڈ شیٹ کے کام سے مطمئن نہیں تھی جس کی وجہ سے یہ معاہدہ ختم ہو گیا اور کمپنی کی خدمات کا طے شدہ عوضانہ ادا کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ اس تنازعہ کو کمپنی اور اس کا مالک کاوے موساوی لندن کی عدالت میں لے گیا جس نے نیب کو سترہ ملین ڈالر ادا کرنے کا حکم دیا۔ البتہ نیب کو شاید برطانوی عدالت کا حکم بھی انصاف پر مبنی نہیں لگا اور یہ رقم کئی برس تک ادا کرنے سے گریز کیا گیا۔ حال ہی میں برطانوی ہائی کورٹ نے دراصل اسی پرانے معاملہ میں ادائیگی نہ ہونے پر حکم دیا تھا کہ پاکستان ہائی کمیشن لندن کے اکاؤنٹ سے مطلوبہ رقم جو اصل زر، اخراجات اور سود وغیرہ ملا کر 28 اعشاریہ 7 ملین ڈالر تھی، وصول کی جائے۔ یہ حکم آنے کے بعد بھی نیب اور ہائی کمیشن آف پاکستان نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ نیب نے یہ سمجھا ہوگا کہ 'احتساب کرنے والوں' کو کون پکڑ سکتا ہے جبکہ لندن کا پاکستانی ہائی کمیشن یہ سوچنے میں حق بجانب ہوگا کہ اسے تو سفارتی استثنا حاصل ہے، اس کے اکاؤنٹ کو کیسے ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔ تاہم جب ہائی کمیشن کے بنک کو عدالتی حکم پہنچایا گیا تو اس نے مقررہ تاریخ کو وہ رقم پاکستانی اکاؤنٹ سے منہا کرنے کا نوٹس ہائی کمیشن کو بھجوا دیا۔ بنک کی اس اطلاع پر بھی ہائی کمیشن کا فوری جواب یہی تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر بنک اس کے اکاؤنٹ سے رقم کیسے ادا کر سکتا ہے۔ لیکن بنک برطانیہ میں رجسٹر ہے اور اسے سفارت خانہ کی طرح سفارتی استثنا بھی حاصل نہیں ہے لہذا وہ اپنے فیصلہ پر قائم رہا اور یہ رقم بلاک کر دی گئی۔ پاکستان میں اٹارنی جنرل نے اس تنازعہ کو نیب کی غلطی قرار دیا اور کہا کہ قانونی طور سے یہ ادائیگی

ہونی چاہیے تھی۔ تمام راستے بند دیکھ کر بالآخر حکومت پاکستان نے بتایا رقم ادا کر دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی وزارت خارجہ نے اصرار کیا کہ وہ تمام متعلقہ فورمز پر بنک کے اس اقدام کے خلاف کارروائی یا شکایت کریں گے۔ یہ کارروائی کیا ہوگی اور کس قانون کے تحت اس پر احتجاج کیا جائے گا، اس کے بارے میں فی الوقت عام شہری کو تو کچھ پتہ نہیں ہے جس کی جیب سے یہ کثیر رقم ایک غیر ضروری تنازعہ میں ایک غیر معروف کمپنی کو ادا کی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات البتہ وزارت خارجہ کے لائق فائق اہلکاروں اور نیب کے ذمہ داروں کے علم میں ہوں گی۔ یا پھر وفاقی کابینہ اور وزیر اطلاعات شبلی فراز کو اس بارے میں خبر ہوگی جنہوں نے اعلان کیا تھا کہ 'ایک وزارتی کمیٹی اس معاملہ کی تحقیقات کرے گی'۔

شبلی فراز کے بیان سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ حکومت اب اس سارے معاملہ کا جائزہ لے گی اور دیکھے گی کہ نیب جیسے ادارے نے کیوں کر ایسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا کہ نہ صرف ایک خطیر رقم کسی عذر کے بغیر ایک کمپنی کو ادا کروا دی گئی بلکہ ایک غیر ملکی عدالت میں پاکستان کے خلاف حکم سامنے آنے اور پاکستانی ہائی کمیشن کا اکاؤنٹ منجمد کر کے رقم وصول کرنے کی خبروں سے بیرون ملک پاکستان کی شہرت اور ساکھ کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ البتہ اب وزیر اعظم نے واضح کیا ہے کہ تحقیقات دراصل یہ جائزہ لینے کے لئے کی جائیں گی کہ کاوے موساوی کو شریف خاندان کی پکڑ کرنے کے لئے کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی خزانے سے بذریعہ عدالت رقم وصول کرنے کے بعد اب سود کی مد میں مزید رقم مانگنے والے شخص کا انٹرویو عمران خان کو اس قدر پسند آیا ہے کہ اس کی بنیاد پر انہوں نے متعدد ٹویٹ پیغامات میں نہ صرف پاکستانی اشرافیہ کی لوٹ مار کے ثبوت تلاش کر لئے بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس بھلے مانس کے انٹرویو سے بدعنوانی کے

بارے میں ان کا ربع صدی پرانا 'فلسفہ' درست ثابت ہو گیا ہے۔ براڈ شیٹ نے اگر کوئی ایسی معلومات فراہم کی ہوتیں جن کی بنیاد پر نیب کسی عدالت سے نواز شریف یا ان کے خاندان کو سزا دلوا سکتا تو یہ کام پرویز مشرف کے دور میں ہی مکمل ہو جاتا جو کسی بھی قیمت پر نواز شریف اور ان کی پارٹی مسلم لیگ (ن) کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ پرویز مشرف کے سارے ادھورے کام چونکہ ان کے سب پرانے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پورے کرنے کی ذمہ داری اب عمران خان کے کاندھے پر آن پڑی ہے۔ اس لئے موساوی کے انٹرویو کی روشنی میں انہیں ایک بار پھر سیاسی دشمن اشرافیہ کٹہرے میں کھڑی دکھائی دینے لگی ہے۔ کاوے موساوی یا اس کی کمپنی اگر واقعی قومی وسائل لے کر فرار ہونے والوں کا سراغ لگانے کے قابل ہوتی تو نیب کو اس کمپنی کے ساتھ تنازعہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اور نہ ہی معاملات برطانوی عدالتوں کے ذریعے طے ہوتے۔ بلکہ موساوی بدستور نیب کے 'معاون خصوصی' کی حیثیت سے کام کر رہے ہوتے۔ موجودہ صورت حال سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ براڈ شیٹ، نیب کے اطمینان کے مطابق مناسب معلومات فراہم نہیں کر سکی جس کی وجہ سے طے شدہ معاوضہ ادا کرنے سے گریز کیا جا رہا تھا۔ اور معاملہ عدالتوں میں جا پہنچا۔ اس مقدمہ بازی پر قیمتی قومی وسائل صرف کرنے کے بعد بالآخر عدالتی حکم پر زبردستی اصل زر اور اضافی اخراجات کی مد میں مقررہ معاوضہ سے لگ بھگ دوگنا رقم ادا کرنا پڑی۔ عمران خان یا حکومت کو دراصل اس نا اہلی یا بدانتظامی کا سراغ لگا کر عوام کو بتانا چاہیے کہ اس اسکینڈل کا اصل کردار کون ہے۔ ملک کا جو ادارہ قومی خزانے کو لوٹی ہوئی دولت سے بھرنے کے دعوے کرتا ہے، اس کی نا اہلی سے قومی خزانے اور ملکی شہرت کو کتنا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اس کی بجائے ایک غیر مصدقہ انٹرویو ہمارے وزیر اعظم کی توجہ کا مرکز بنا ہے جس میں موساوی نے ایک بار پھر دعویٰ کیا ہے کہ اس کے پاس متعدد پاکستانیوں کے غیر ملکی اثاثوں کے بارے معلومات موجود ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ کمپنی اس سے پہلے ایک برطانوی عدالت سے لندن کے علاقے ایون فیلڈ میں شریف خاندان کے اپارٹمنٹس کی ملکیت حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام رہی تھی۔ عمران خان لیکن اپنے کرپشن بیانیہ کے سحر میں اس حد تک مبتلا ہیں کہ وہ حقیقت حال سمجھنے، مسائل کا ادراک کرنے اور اپنی حکومت کے تحت کام کرنے والے اداروں کی باز پرس کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتے۔ نیب تو یوں بھی 'خود مختار' ہے اور عمران خان کا 'سیاسی حلیف' بھی ہے۔ جب عمران خان کاوے موساوی کے انٹرویو سے اپنے بیانیہ اور ویژن کی سچائی دریافت کرنے میں مصروف تھے، اس دوران پاک فوج کے سربراہ کوئٹہ تشریف لے گئے اور وہاں اس ماہ کے شروع میں شہید کیے گئے نوجوان ہزارہ کانکنوں کے اہل خاندان سے ملاقات کی اور ان کی دلجوئی کی۔ آئی ایس پی آر کے پریس ریلیز کے مطابق 'جنرل باجوہ نے متاثرہ خاندانوں کے ساتھ وقت گزارا اور ان کے دکھ درد کو سنا۔ انہوں نے پسماندگان کو یقین دلایا کہ شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ اس گھناؤنے جرم میں شریک لوگوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا'۔ آئی ایس پی آر کا یہ بیان پڑھنے اور اس موقع پر جاری کی گئی تصاویر دیکھنے کے بعد جنرل قمر جاوید باجوہ کا ایک ایسا انسان دوست چہرہ سامنے آتا ہے جو عمران خان کے اس عکس سے متضاد ہے جو وہ نعشوں کے ساتھ دھرنا دے کر انصاف کی دہائی دینے والے ہزارہ لوگوں کو 'بلیک میلر' قرار دے کر سامنے لائے تھے۔ مظلوم ہزارہ سے اپنا 'مطالبہ' منوانے کے بعد وزیر اعظم ضرور کوئٹہ گئے اور متاثرین سے ملاقات بھی کی لیکن کسی بات یا طریقہ سے ان کے قلبی رنج و غم کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ یہ تاثر جنرل باجوہ کی ہزارہ کے ساتھ تصویروں سے سامنے آتا ہے، جن میں وہ سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت کا اظہار کرنے کے علاوہ بچوں کی پیشانی چوم کر اپنا دکھ و ہمدردی ظاہر کر رہے ہیں۔ یہ وضاحت بھی سامنے نہیں آئی کہ جنرل باجوہ نے چند روز پہلے وزیر اعظم کے ہمراہ کوئٹہ کا سفر کیوں نہیں کیا۔ البتہ آج کے دورہ کے دوران انہوں نے تاریخی الجھنوں اور دشمن کو اس سانحہ کا ذمہ دار قرار دینے کی بجائے، خود یہ وعدہ کیا ہے کہ مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ یوں تو عمران خان کو کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کیا وہ جنرل باجوہ کے دورہ کوئٹہ سے یہ سیکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ کسی کے مرنے پر پسماندگان سے کیسا رویہ اختیار کرنا مناسب ہوتا ہے؟

❁❁❁

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

مودودی کی فکر اور دو قومی نظریہ سے مایوسی کا سفر

ڈاکٹر منظور احمد کی یادیں (کراچی سے رام پور تک)۔

تحریر: لیاقت علی

ڈاکٹر منظور احمد اپنی خودنوشت میں مودودی کے نظریات اور پاکستان کی فکری بنیاد سے مایوسی اور بددلی کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد نے کراچی یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز اور ایم اے کرنے کے بعد لندن یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ 1954-1994 تک سندھ مسلم کالج اور کراچی یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھایا۔ کراچی یونیورسٹی کے اسلامی علوم کے ڈین، ہمدرد یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ انھوں نے 'اقبال شناسی' اور 'اسلام چند فکری مسائل' پاکستان پس منظر اور پیش منظر کے علاوہ متعدد مقالے لکھے جو دنیا کے معروف رسائل میں شایع ہوئے۔ ڈاکٹر منظور احمد تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست رام پور میں گذشتہ صدی کی تیسری دہائی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ریاست کی عدالت عالیہ میں محافظ دفتر کے محکمہ میں کام کرتے تھے۔ وہ گیارہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ رام پور سے پاس کرنے کے بعد دسمبر 1950 میں انھیں اس خیال سے کراچی بھیج دیا گیا کہ 'مجھے اپنی تعلیم کے سلسلے میں کوئی رخ متعین کر لینا چاہیے'۔ 'انٹرنس پاس کرنے سے قبل ہی میرا تعارف مولانا مودودی کی کتابوں سے ہوا اور 1950 تک ان کوئی چھپی ہوئی تحریر شائد ایسی ہوگی جو میں نے نہ پڑھ لی ہو'۔ لیکن چند سال بعد ڈاکٹر منظور احمد کو ادراک ہوا کہ سماجی علوم کی کسی صنف میں بھی جماعت کے پاس افراد کی ضروری اور مکتفی ذہنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ان کے دقیق مطالعہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ لہذا ان تمام مضامین میں صحافیانہ عموم کو جو مولانا مودودی کی طاقتور تحریروں میں ملتا ہے علم کا آخر مان لیا گیا اور زندگی کے ہر پہلو اور ہر مشکل کو حل کرنے ایک آسان اور کم معیار عمومی حل تلاش کر لیا گیا ہے۔ میرے ایک دوست از راہ تفنن کہا کرتے تھے کہ جماعت اسلامی کے پاس ہر مسئلہ کا حل چھ آنے میں مل جاتا ہے یہ ان کتابچوں کی قیمت تھی جو مکتبہ جماعت اسلامی چھاپا کرتا تھا۔

مولانا مودودی کا ان دنوں موقف تھا کہ جدید تعلیمی ادارے دراصل 'قتل گاہیں' ہیں اور ان میں مسلمان نوجوانوں کو تعلیم حاصل کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ مولانا مودودی نے 'تعاون باالطاغوت' کا نظریہ دیا تھا جس کے مطابق جدید تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل اور ریاستی اداروں میں ملازمت اختیار کرنا طاغوتی قوتوں سے تعاون کرنے کے مترادف ہے تھا۔ مولانا مودودی کے اس نظریئے سے متاثر ہو کر نوجوانوں نے تعلیمی درسگاہیں چھوڑ دی تھیں اور خود کو جماعت کی سرگرمیوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ڈاکٹر منظور احمد کو ان کے والدین ڈاکٹر بنانے کے خواہاں تھے لیکن انھیں میڈیسن کے شعبے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے سندھ مسلم کالج میں بی۔اے آنرز (فلسفہ) میں پاس کر کے کراچی یونیورسٹی میں ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ 'کراچی یونیورسٹی میں مختلف مضامین کے نصاب چونکہ علی گڑھ یونیورسٹی والوں نے بنائے تھے اس لئے وہ کم و بیش ان نصابوں کا چربہ تھے جو علی گڑھ میں پڑھائے جاتے تھے۔ بعض اساتذہ تو ایسے بھی تھے جو اپنے زمانہ طالب علمی میں تیار کردہ نوٹس ابھی تک اپنے سٹوڈنٹس کو لکھواتے تھے'۔ نصاب کو اپ ڈیٹ کیسے کرنا ہے اس بارے میں اپنے ایک استاد کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر منظور احمد لکھتے ہیں کہ 'عام روش کے برخلاف ہر سال اپنے اپ کو اپ ڈیٹ کر لیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ جس سال انھوں نے ایم۔اے پاس کیا ہے۔ وہ ہر سال اپنے حساب کے حل کیے سوالوں کو نئی کاپیوں پر اتار لیتے ہیں اور اس طرح ہر سال اپ ڈیٹ ہو جاتے ہیں'۔ ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد ڈاکٹر پہلے کالج اور بعد ازاں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ سے منسلک ہو گئے۔ ان کے نزدیک 'کراچی یونیورسٹی میں علمی کام کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ پی ایچ ڈی کے تھیسس، کم از کم معاشرتی اور انسانی علوم میں کم لکھے گئے اور جو لکھے گئے ان میں اکثریت کم معیار کی تھی زیادہ کام اردو اور اسلامیات میں ہوا اور ان دونوں مضامین میں فارمولا فلموں کی طرح تھیسس لکھے جاتے رہے۔ پہلے آنجہانی شاعروں

اور ادیبوں پر اس نوعیت کے کہ 'آنجہانی حیات و آثار'۔ اس کے بعد بعض لوگوں نے خود اپنے آپ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کروانا شروع کر دی'۔

پاکستان آ کر ڈاکٹر منظور احمد نے خورشید احمد، خرم جاہ مراد اور چند دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مل کر اسلامی جمعیت طلبہ کی بنیاد رکھی لیکن وہ جماعت اسلامی کی تنظیم کا حصہ کبھی نہ بنے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ 'لوگ پوچھتے تھے کہ میں جماعت اسلامی میں کیا کر رہا تھا۔ سیاسی جواب تو یہ ہے کہ میں کبھی جماعت میں نہیں تھا لیکن سوال پوچھنے والے کا منشا یہ نہیں ہے کہ میں جماعت کا رکن تھا یا نہیں بلکہ یہ ہے کہ جماعت جس طرح کا بند ذہن رکھتی اس میں، میں کس طرح فٹ ہوتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں جماعت سے متعارف ہوا تھا اس وقت بھی میرا ذہن مستقل اپنے آپ سے حالت جنگ میں رہتا تھا۔ (اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ) میں کچی سمجھ رکھنے والا جماعت کے لٹریچر کے طرز استدلال کے دھارے میں بہہ گیا'۔ تعلیم اور عملی زندگی کے تجربات نے ڈاکٹر منظور احمد کو مودودی کے فہم اسلام اور مسلمان قومیت کے تصور سے مایوس کیا اور وہ یہ سوچنے لگے کہ کیا وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے قیام کو ساٹھ سال ہو چکے ہیں لیکن ہم ابھی تک اپنے سیاسی معاملات کو جمہوری نہج پر چلانے میں ناکام رہے ہیں۔ آخر پاکستان کی تعمیر میں کیا خرابی ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ ان کے نزدیک بحیثیت مجموعی ہمارے ہاں تاریخ کی تنقیدی تفہیم کا شعور گہرا نہیں ہے۔ ہم تاریخی واقعات کو قضا و قدر سمجھتے ہیں۔ اکثر تاریخی ہستیوں کی ضرورت سے زیادہ تکریم کرنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کو صنم بنا کر تقریباً پوجنے لگتے ہیں یا ان پر تنقیدی محاکمہ کرنے کو روا نہیں جانتے۔

تاریخی تبدیلیوں میں ہم صرف شخصیات کے رول کو تبدیلیوں کے عمل میں لازمی سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے تاریخی تفہیم اور معاشروں میں تبدیلی کے اصولوں سے ناواقف رہتے ہیں۔ ہماری تہذیب میں عموماً اور مذہب میں بالخصوص جو تقلیدی روایت مستحکم ہوگئی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے اپنے متقدمین کو ہر قسم کی غلطی سے مبرا جانا ہے'۔

ڈاکٹر منظور احمد کے نزدیک آل انڈیا مسلم لیگ کے یکے بعد دیگر تین دساتیر میں سے کسی میں بھی اسلامی ریاست کا قیام اغراض و مقاصد میں شامل نہیں تھا اور پاکستان کا مطالبہ جیسا کہ آج کل مفروض کیا جاتا ہے "اسلام" کے تحفظ کی خاطر کیا گیا تھا تو ہندوستانی مسلمانوں کا قصور تھا کہ ان کو اور ان کے "اسلام" کو ہندوستان کی اکثریتی تہذیبی اکائی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اس ژولیدہ فکری کے نتیجہ میں یہ قرارداد ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی تقسیم کا باعث بن گئی لیکن 'اسلام' اور مسلمانوں کی ایک تہائی آبادی کے لئے کوئی واضح اور محفوظ قلعہ بن سکی۔۔

سوچنے کی بات تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان کوئی معمولی اقلیت نہ ہوتے بلکہ اپنی تعداد کے اعتبار سے اور ممکنہ طور پر اپنی فہم و فراست اور محنت کی بنیاد پر ہندوستانی قسمت کے فیصلوں میں برابر کے حصہ ہوتے۔ اتنی بڑی اقلیت کے حقوق کے نظر انداز کرنا ہندوستانی ریاست کے بس میں نہیں ہوتا۔ دراصل برصغیر کے مسلمانوں کی دشواری یہ تھی کہ ان میں ایسے دانشور جو زمانہ جدید کے سماجی عمرانی، معاشی اور سیاسی مسائل سے واقف ہوں نہ ہونے کے برابر تھے۔ (صفحہ 34)۔

ڈاکٹر منظور احمد کے نزدیک تحریک پاکستان کے رہنما یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ اس اتحاد کی بڑی وجہ، اسلامی جذبہ کے ساتھ ہی، یہ بھی تھی کہ ایک 'غیر' موجود ہے جس کے خلاف مسلمان متحد ہوئے تھے یعنی ہندوستان کی دوسری تہذیبی اکائی اور ایک مرتبہ اس 'غیر' کے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد، محض اسلامی جذبہ کے زیر اثر مسلمانوں کی ایک قوم کی صورت مجتمع رہنے میں مشکلات پیش آ سکتی ہیں (صفحہ 35)۔

ڈاکٹر منظور احمد سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا مسئلہ اس ابہام سے پیدا ہوا کہ آیا ایک نئے ملک کا قیام اسلامی نظام کے قائم کرنے کے لئے ضروری تھا، یا مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے؟ اور کیا واقعی مسلمانوں کے حقوق متحدہ ہندوستان میں اتنی کثیر اقلیت ہونے کے باوجود پائمال کئے جا سکیں گے نہیں؟ ان باتوں پر سیر حاصل سوچ بچار نہیں کی گئی بلکہ وقتی ضرورتوں کے پیش نظر ان کو غالباً قصداً مبہم رکھا کر کام چلایا جاتا رہا۔ عوامی تحریک کو ہوا دینے کے لئے مسلمانوں کا سب سے بڑا جذباتی محرک اسلام کی حفاظت کا نعرہ اور اسلامی نظام کا قیام تھا۔ مسلمانوں کی رومانی طبیعت میں اسلامی نظام کے ذریعہ موجودہ زمانہ میں ایک ارضی جنت بنانے کی خواہش بڑی شدت سے موجزن تھی۔ قائداعظم نے بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس محرک کو استعمال کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ (صفحہ 36)۔

ڈاکٹر منظور احمد کا کہنا ہے کہ قیام پاکستان کا مقصد مغربی طاقتوں کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ برطانوی حکومت کی سرکاری دستاویزات ان کی مدت اخفاء ختم ہونے کے بعد اب لوگوں کی دسترس میں ہیں۔ برطانیہ اور مغربی طاقتوں کی دلچسپی پاکستان کی تشکیل میں اس لئے تھی کہ ان کو آنے والے دنوں میں مشرق وسطی اور روس دونوں میں اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے جغرافیائی اعتبار سے ایک ایسا ملک مہیا ہو سکے گا جس کو وہ آسانی سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کر سکیں گے اور ان کو شمالی مغربی علاقوں میں ہوائی اڈے اور کراچی کی بندرگاہ ایک سمندری سہولت کے طور پر میسر ہو سکیں گے۔ پاکستان کے قیام میں یہ سارے محرکات کام کر رہے تھے جو اس نئی ریاست کے لئے پیچیدہ اور جلد حل نہ ہونے والے مسائل کا پیش خیمہ تھے۔

ماونٹ بیٹن کی یادداشتوں میں 7۔جولائی 1947 کی ایک دستاویز ملتی جس کے سرنامہ پر 'انتہائی خفیہ' لکھا ہے اور جس پر کسی کے دستخط نہیں ہیں اس میں لکھا گیا ہے کہ 'مشرق وسطی اور اس کے تیل کے ذخائر کے لئے کسی بھی دفاعی منصوبہ میں وادی سندھ، مغربی پنجاب اور بلوچستان بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔سوویت یونین کی ممکنہ جارحیت کے مقابلہ کے لئے کراچی ہی وہ بندرگاہ ہے جہاں سے دفاعی عمل ممکن ہے' (صفحہ 38)۔

ڈاکٹر منظور احمد اپنی یادوں میں مودودی کی فکر سے مایوسی کا اظہار کرتے اور دوقومی نظریہ بارے سوالات اٹھاتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ پاکستان بنانے کا مقصد مبہم اور غیر واضح تھا اور متضاد محرکات کا شکار تھا اور اگر پاکستان بنانے کا مقصد 'اسلام' تھا تو اس کے خدوخال کیا تھے؟ کیا وہ جو قائداعظم کی مختلف اوقات میں کی گئی تقریروں میں مبہم انداز میں ملتا ہے یا وہ جس کی وکالت مولانا مودودی کر رہے تھے یا سیدھا سادا روایتی شریعت کا نفاذ جس کا تجربہ افغانستان میں (طالبان کے ہاتھوں) ہوا تھا؟ اور یہ وہ امور تھے جس کے لئے مسلمانوں کو وقت ملا اور نہ ذہنی صلاحیت میسر تھی جو کارگر ہوسکتی (صفحہ 40)۔

ڈاکٹر منظور احمد نے رام پور سے لاہور پہنچنے پر مولانا مودودی سے اپنی پہلی ملاقات کا جو احوال لکھا ہے وہ مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔لکھتے ہیں کہ 'بڑی تمنا سے اچھرہ میں مولانا مودودی کا گھر دریافت کرتا ان کے بنگلہ پہنچ گیا۔ملازم سے اطلاع کرائی اور برآمدہ میں کرسی پر انتظار میں بیٹھ گیا۔ذہن میں چھوٹے سے شہر کا ایک چھوٹا سا تصور تھا۔کبھی میں جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا ابواللیث کے گھر گیا، کنڈی کھٹکائی تو خود مولانا برآمد ہوتے تھے اور حسب موقعہ اور ضرورت یا تو کھڑے کھڑے یا بٹھا کر بات کر لیتے تھے۔یہی صورت حال دوسروں بزرگوں کی تھی۔اب مجھے یاد نہیں لیکن شائد گھنٹہ بھر انتظار کے بعد مولانا برآمد ہوئے۔میں نے ادب سے سلام کیا اپنا تعارف کرایا اور ہندوستان کے اکابرین کا سلام پہنچایا۔مولانا نے شائد ہی کوئی بات کی ہو اور ملاقات میں کسی جذبہ خوشی کا اظہار کیا ہو یا چہرے پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی ہو۔ہم تو یہ سنتے آئے تھے کہ مسکرا دینا صدقہ ہے لیکن مولانا کے بہت ہی سرد رویہ سے اس وقت بہت دل برداشتہ ہوا اور اجازت چاہی۔خیال ہوا کہ شائد مولانا رسماً ہی کہیں کہ ٹھہریں چائے شربت کچھ پی لیں لیکن ایک گھنٹہ کا انتظار دو منٹ کی ملاقات پر ختم ہوگیا۔مولانا کا وہ ہیولا جو ذہن میں قائم ہوا تھا ہوا میں تحلیل ہوگیا (صفحہ 98)۔

ڈاکٹر منظور احمد اپنی خودنوشت میں مودودی کے نظریات اور پاکستان کی فکری بنیاد سے مایوس اور بددلی کا اظہار کرتے ہیں۔

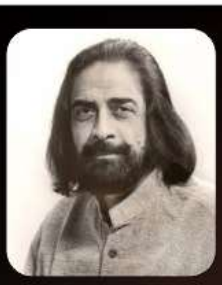

عبیداللہ علیم

خیال و خواب ہوئی ہیں محبتیں کیسی
لہو میں ناچ رہی ہیں یہ وحشتیں کیسی

نہ شب کو چاند ہی اچھا، نہ دن کو مہر اچھا
یہ ہم پہ بیت رہی ہیں قیامتیں کیسی

وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی

عذاب جن کا تبسم، ثواب جن کی نگاہ
کھنچی ہوئی ہیں پسِ جاں یہ صورتیں کیسی

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

جو بے خبر کوئی گزرا تو یہ صدا دے دی
میں سنگِ راہ ہوں مجھ پر عنایتیں کیسی

نہ صاحبانِ جنوں ہیں، نہ اہلِ کشف و کمال
ہمارے عہد میں آئیں کثافتیں کیسی

جو ابر ہے وہی اب سنگ و خشت لاتا ہے
فضا یہ ہو تو دلوں میں نزاکتیں کیسی

یہ دورِ بے ہنراں ہے بچا رکھو خود کو
یہاں صداقتیں کیسی، کرامتیں کیسی

پبلک سروس کمیشن! یا ٹھہرا ہوا پانی؟

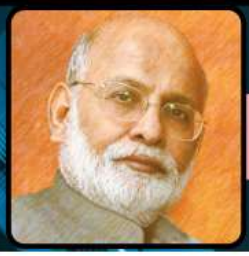

تحریر: محمد اظہار الحق

پنجاب پبلک سروس کمیشن میں جو کچھ ہوا آپ میڈیا میں پڑھ اور سُن چکے ہوں گے! لیکچرر، تحصیلدار، اکاؤنٹس افسر، سمیت خالی اسامیاں پُر کرنے کے لیے جو امتحانات کمیشن نے لینے تھے، یا لیے، ان کے پرچے لاکھوں میں فروخت ہوئے۔ اسے لطیفہ سمجھیے یا ٹریجڈی کی انتہا کہ اینٹی کرپشن کے محکمے کی اسامیوں کے پرچے بھی بیچے گئے۔ جن دو امیدواروں نے انسپکٹر اینٹی کرپشن لگنے کے لیے امتحان میں ٹاپ کیا، انہوں نے بھی پرچے خریدے تھے۔ لیکن یہ جو کچھ آپ نے پڑھا یا سنا یہ تو صرف مکھن ہے جو اوپر کی سطح پر آ گیا۔ نیچے کیا ہے؟ لسّی یا کچھ اور؟

پبلک سروس کمیشن ایک ادارہ ہے جو سرکاری محکموں کو افرادی قوت مہیا کرتا ہے۔ اس کام کے لیے امتحان لیتا ہے۔ تحریری اور زبانی بھی۔ مقابلے کے امتحان بھی یہی ادارہ لیتا ہے۔ وفاق میں کمیشن کو فیڈرل پبلک سروس کمیشن (ایف پی ایس سی) کہا جاتا ہے۔ صوبے میں کمیشن صوبے کے نام کے حوالے سے جانا جاتا ہے' جیسے پنجاب پبلک سروس کمیشن، سندھ پبلک سروس کمیشن وغیرہ! جو سوال سب سے پہلے ذہن میں ابھرتا ہے، یہ ہے کہ خود ان اداروں کی، یعنی فیڈرل اور صوبائی پبلک سروس کمیشنوں کی افرادی قوت کہاں سے آتی ہے؟ جو افراد پبلک سروس کمیشن چلاتے ہیں، امیدواروں کے امتحان لیتے ہیں، انٹرویو لیتے ہیں، وہ خود کہاں سے لیے جاتے ہیں؟ کیا ان کے لیے پریس میں کوئی اشتہار دیا جاتا ہے؟ کیا کوئی امتحان ہوتا ہے؟ کیا کوئی کمیٹی ان کا انتخاب کرتی ہے؟ کیا کابینہ یا منتخب اسمبلی اس پروسیس میں کوئی کردار ادا کرتی ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ آپ یہ جان کر یقینا حیران ہوں گے کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن، پنجاب پبلک سروس کمیشن اور دوسرے صوبوں کے پبلک سروس کمیشنز کے ممبر نوکر شاہی کے ریٹائرڈ ارکان سے لیے جاتے ہیں اور ان کا انتخاب صرف اور صرف سفارش، ذاتی شناسائی، اور اپروچ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ شریف خاندان کی حکومت کے دوران جو پولیس افسران سے ذاتی وفاداری نبھاتے تھے، انہیں ریٹائرمنٹ پر پنجاب پبلک سروس کمیشن کا ممبر بنا دیا جاتا تھا۔ یہی کچھ پیپلز پارٹی کے زمانوں میں ہوتا رہا۔ آمریت کے ادوار میں بھی ذاتی واقفیت واحد معیار تھی۔ اب بھی یہی طریق کار ہے (طریق کار تو اسے کہا ہی نہیں جا سکتا)۔ وفاق میں بھی یہی ہوتا رہا ہے۔ یہی ہو رہا ہے۔ جو بیوروکریٹ ریٹائر ہوتا ہے، اگر اس کی رسائی اوپر کی سطح تک ہے تو اسی شام اس کی تعیناتی ہو جاتی ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجودہ حکومت کے عہد میں بھی ملتی ہیں۔ جن کی رسائی نہیں ہے، وہ چُپ چاپ، دفتر سے اپنا سامان اٹھاتے ہیں اور گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ کس نمی پرسد کہ بھیّا کیستی؟

اس کا حل یہ نہیں کہ تمام ریٹائرڈ افسروں کو باری باری وفاقی اور صوبائی پبلک سروس کمیشنوں میں تعینات کیا جائے۔ یہ افسر اپنی ملازمت کی میعاد پوری کر کے ساٹھ سال کی عمر پر پہنچ کر ریٹائر ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہر ماہ ایک معقول رقم پنشن کے طور پر ان کے بینک اکاؤنٹ میں پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر دوران ملازمت بیرون ملک تعیناتیوں کے مزے بھی اُڑا چکے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مزید پانچ سال کے لیے پبلک سروس کمیشن کی ممبری انہیں سونپنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ اس ممبری کے دوران بھی اپنے بڑھاپے کو سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی گھر کی تعمیر کرتا ہے۔ کوئی بچوں کی شادیوں میں مصروف رہتا ہے۔ ممبری کی سہولیات انہی ذاتی کاموں کے لیے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ کمیشن کے امور میں بہتری لانے کے لیے تخلیقی صلاحیتیں، اگر ہوں بھی تو، استعمال کرنے کا ان کے پاس وقت ہوتا ہے نہ جذبہ نہ شوق! پینتیس چالیس سال کی سرکاری ملازمت ان کے تخلیقی جوہر کو پہلے ہی مار چکی ہوتی ہے۔ یوں بھی کمیشن کی ممبری انہی افسروں کو پیش کی جاتی ہے جو تخلیقی صلاحیتوں کے بجائے دوسری صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ ان دوسری صلاحیتوں میں اصحاب اقتدار کو خوش رکھنے کی صلاحیت سب سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ سی ایس ایس کا انٹرویو لیتے وقت یہ گئے گزرے بزرگ اپنے زمانے سے باہر نہیں نکلتے۔ خود انہوں نے انٹرویو ہو چی منہ کے زمانے میں دیا ہوتا ہے۔ ہم عصر مسائل کا ادراک کم ہی رکھتے ہیں۔ یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل، نئے دور کے نوجوان امیدوار، ان ممتحن حضرات کے علم کے آگے بے بس بھی ثابت ہو سکتے ہیں' اور ہوتے بھی ہیں۔ انصاف کا راستہ یہ ہے کہ اس سارے قصے میں نجی شعبے کو شامل کیا جائے۔ ایک بورڈ کی تشکیل کی جائے' جو براہ راست، ریاست کے سربراہ، یعنی صدر مملکت کو جوابدہ ہو۔ اس بورڈ میں پورے ملک کی نمائندگی ہو۔ صنعت کار، ماہرین زراعت، پروفیسر، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، اس بورڈ کے ممبر ہوں۔ یہ بورڈ اُن امیدواروں کے انٹرویو لے جو پبلک

سروس کمیشن کے ممبر بننا چاہتے ہیں۔ اُس سے پہلے میڈیا میں وسیع پیمانے پر اشتہار دیے جائیں۔ سرکاری اور نجی، دونوں شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے درخواستیں طلب کی جائیں۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوں۔ پچاس پچپن سے کم عمر کے ہوں۔ عصری مسائل کا شعور رکھتے ہوں تاکہ ملک کو چلانے کیلئے ان نوجوانوں کا انتخاب کریں جن کا وژن، تعلیم، سوچ کا انداز جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ ایک بات یقینی ہے کہ جب بھی اس قسم کی تبدیلی کا ڈول ڈالا جائے گا، سب سے زیادہ مخالفت بیوروکریسی کا وہ حصہ کرے گا جو اوپر تک رسائی رکھتا ہے۔ وفاقی اور صوبائی پبلک سروس کمیشن ان معمر افسروں کو سرسبز چراگاہوں کی طرح نظر آتے ہیں' جہاں ریٹائرمنٹ کے بعد یہ حضرات پانچ پانچ سال کے لیے ایک انتہائی مراعات یافتہ زندگی گزارتے ہیں۔ جب نوجوانوں کو کمیشن کا ممبر لگایا جائے گا تو وہ کچھ منصوبہ بندی کریں گے، کچھ اصلاحات لائیں گے، عشروں کے اس ٹھہرے ہوئے پانی میں کچھ کنکر پھینکیں گے جس سے ارتعاش پیدا ہوگا۔ مکھی پر مکھی مارنے کے بجائے کچھ تبدیلی لائیں گے۔ موجودہ حکومت تبدیلی کا وعدہ کر کے آئی تھی۔ امید تھی اس قسم کے کلیشے ان کی نظروں میں ترجیح حاصل کریں گے، انقلابی اقدامات کئے جائیں گے کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد'۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! کچھ بھی نہیں ہوا! گلی سڑی بیوروکریسی جب مستقبل کی بیوروکریسی کا انتخاب کرے گی تو جو نتیجہ نکلے گا وہی ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ کچہریوں، تحصیلوں، پٹوار خانوں اور تھانوں کی حالت دیکھ لیجیے۔ خلق خدا دھکے کھا رہی ہے۔ رشوت کے بغیر کام ہو جانے کا تصور بھی ناممکن ہے، شیر شاہ سوری اور اکبر نے اپنے اپنے زمانوں میں نئے سسٹم متعارف کرائے تھے۔ پھر انگریز آئے تو انہوں نے اپنے استعمارانہ مفادات کا تحفظ کیا۔ بندوبست دوامی رائج کیا۔ وفادار جاگیرداروں کا گروہ کھڑا کیا۔ ان کی آل اولاد کے لیے ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جہاں تعلیم کم اور پبلک ریلیشننگ زیادہ ہوتی تھی۔ انگریز چلے گئے' مگر انگریزی نظام بدستور قائم ہے۔ بیوروکریسی اُس زمانے میں کم از کم ملکہ کی وفادار تھی کیونکہ ملکہ بمنزلہ ریاست تھی۔ آج بیوروکریسی کسی کی وفادار نہیں۔ ریاست کی تو بالکل نہیں۔ نئے زمانے کے نئے تقاضے ہیں۔ کاش کوئی ایسی حکومت آئے جو پاکستان کو لارڈ کلائیو کے زمانے سے نکال کر آج کے دور میں لے آئے۔

آیئے! دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں!!

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاءاللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

Lahore International Magazine

Instagram: @lahoreintl

Twitter: @lahoreintl

Facebook: lahoreinternational

YouTube: lahoreinternational

Google+: lahoreintl

Contact: +447940077825

Whatsapp: +447940077825

Email: lahoreintlondon@gmail.com

علامہ اقبال اور قادیانیت: تعلق اور لاتعلقی

تحریر: زاہد چوہدری

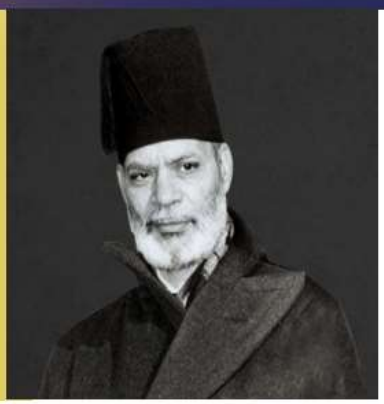

عنوان سے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے جماعت احمدیہ کو اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ قرار دیا تھا۔ انہوں نے اپنی اس تقریر میں مسلمانان ہند کے مختلف اسالیب کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا' پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔

یہ تقریر انگریزی میں لکھی گئی تھی اور اس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دنوں ظفر علی خان کو بھی جماعت احمدیہ کے بارے میں علامہ اقبال کی اس رائے سے اختلاف نہیں تھا۔ حالانکہ علامہ اقبال کی اس تقریر سے بہت پہلے جماعت احمدیہ کے بانی مرزا غلام احمد اپنے عقائد اور دعاوی کا برملا اظہار کر چکے تھے۔ علامہ اقبال نے یہ تقریر مرزا غلام احمد کے انتقال (1908) کے تین سال بعد کی تھی۔ مرزا غلام احمد نے مارچ 1882 میں دعوی کیا تھا کہ الہام ہوا ہے اور اللہ تعالی نے انہیں ایک خاص مقصد تفویض کیا ہے دوسرے لفظوں میں گویا وہ مامور من اللہ ہے۔ مرزا غلام احمد کی زندگی ہی میں ان کو پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد کی تائید حاصل ہوگئی تھی۔ متعدد ممتاز اور ذی اثر افراد ان کے پیروکاروں میں شامل ہوگئے تھے۔ سنہ 1908 میں جب مرزا غلام احمد کا انتقال ہوا تو حکیم نورالدین ان کے ''خلیفہ اول'' مقرر ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کی مذکورہ بالا تقریر وہ اسی ''خلیفہ اول'' کے عہد میں کی گئی تھی۔ اس ''خلیفہ اول'' کا انتقال 1914 میں ہوا تھا اور ان کی جگہ مرزا غلام احمد کا بیٹا مرزا بشیر الدین محمود ''خلیفہ ثانی'' مقرر ہوئے تھے۔ جانشینی کے تنازعہ کو لے کر جماعت احمدیہ میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ جماعت کا ایک حصہ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی کی سرکردگی میں الگ ہوگیا تھا اور ایک علیحدہ جماعت ''لاہوری پارٹی'' وجود میں آ گئی تھی۔ جماعت پر قبضے کی لڑائی کو بعد ازاں نظریاتی رنگ دے دیا گیا۔ لاہوری پارٹی مرزا غلام احمد کو زیادہ سے زیادہ مجدد کا درجہ دینے کو تیار تھی جب کہ قادیانی جماعت کے نزدیک وہ ''نبی'' تھے۔ لاہوری جماعت ہنوز موجود اور انجمن اشاعت اسلام کے نام سے کام کر رہی ہے۔ بظاہر احمدیت کے بارے میں اپنی رائے پر علامہ اقبال 1931-32 تک قائم رہے تھے کیونکہ اس سے قبل انہوں نے اس جماعت پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ نیاز فتح پوری کے بیان کے مطابق علامہ کی اس رائے میں بنیادی تبدیلی 1933 کے بعد آئی تھی جب ''احرار کی شورش سے مرعوب ہو کر اپنی جان چھڑانے کے لئے وہ ایک بیان دینے پر مجبور ہوگئے تھے''۔ لیکن ایس۔ ایم۔ اکرام اور بعض دیگر مورخین اشاروں کنایوں میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی قادیانی فرقہ پر تنقید محض 'احرار کی شورش' سے جان چھڑانے کی بنا پر نہیں تھی بلکہ قادیانیت سے بے زاری کے پس پشت ذاتی اور سیاسی وجوہات بھی کارفرما تھیں۔ ان کے نزدیک 1931 میں کے اواخر میں علامہ اقبال اور جماعت احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کے مابین کشمیر کمیٹی جس کے علامہ اقبال سیکرٹری اور مرزا بشیر الدین محمود صدر تھے اور جو کشمیری مسلمانوں کو ڈوگرہ راج کے ظلم وستم سے بچانے کے لئے قائم کی گئی تھی کے طریقہ کار اور مقاصد کے سوال پر اختلاف رائے پیدا ہو چکا تھا لیکن اصل وجہ نزاع 1932 میں پیدا ہوئی تھی جب وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے سر ظفر اللہ خان کو ایگزیکٹو کونسل میں عارضی رکن مقرر کرنے کا اعلان کیا تھا۔ سنہ 1932 میں میاں فضل حسین نے علالت کے باعث وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے چار ماہ کی رخصت لی تھی اور ساتھ ہی وائسرائے لارڈ ولنگڈن سے سفارش کی تھی کہ ان کی جگہ مختصر مدت کے لئے ظفر اللہ خان کا بطور رکن تقرر کر دیا جائے۔ وائسرائے نے میاں فضل حسین کی سفارش کو مانتے ہوئے ظفر اللہ خان کو ایگزیکٹو کونسل میں عارضی رکن کے طور پر مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ ظفر اللہ خان کی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تقرری علامہ اقبال کے لئے کسی صدمے سے کم نہ تھی کیونکہ وہ خود کو ظفر اللہ کی نسبت اس عہدے کا زیادہ حقدار اور اہل سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال کی نہ صرف یہ خواہش تھی بلکہ انھیں یقین تھا کہ میاں فضل حسین اپنی جگہ ان کی تقرری کی سفارش کریں گے کیونکہ علامہ اقبال کا شمار میاں فضل حسین کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ دونوں گورنمنٹ کالج میں زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور پنجاب کی سیاست کے حوالے سے بھی دونوں کا نکتہ نظر ایک تھا۔ نہ صرف علامہ اقبال کو یقین تھا کہ وہ یہ عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے بلکہ پنجاب کے شہری مسلمانوں کو بھی امید تھی کہ آئندہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں کوئی اسامی خالی ہوئی اس پر علامہ اقبال کا تقرر یقینی ہے۔ چنانچہ لاہور کے معتبر اخبار روزنامہ ٹربیون میں یہ خبر بھی شایع ہوگئی تھی کہ سر فضل حسین کی رخصت کے دوران ان کی جگہ ڈاکٹر اقبال کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن نامزد کیا جائے گا لیکن یہ امیدیں اس وقت خاک میں مل گئیں جب علامہ اقبال کی بجائے ظفر اللہ خان کو نامزد کر دیا گیا۔ میاں فضل حسین کی بے وفائی علامہ اقبال کے لئے بہت زیادہ مایوسی کا باعث بنی تھی۔ ظفر اللہ خان کا تعلق چونکہ جماعت احمدیہ سے تھا اس لئے انھوں نے اپنے غصے کا ہدف میاں فضل حسین کی بجائے جماعت احمدیہ کو بنا لیا اور اس کے خلاف مضامین کی ایک سیریز لکھی جن میں جماعت احمدیہ کے عقائد پر تنقید و تنقیض کی گئی تھی۔ سنہ 1932 میں سر ظفر اللہ خان کی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں عارضی رکن کے طور پر تقرری سے قبل علامہ اقبال نے اپنی کسی تقریر یا تحریر میں کبھی مرزا غلام احمد اور اس کی جماعت احمدیہ پر نکتہ چینی نہیں کی تھی اور اس کا ذکر مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی کتاب سیرت المہدی مطبوعہ 1939 میں کیا تھا۔ خود علامہ اقبال نے بھی 1897 میں مرزا غلام احمد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ان کا نام 313 مقلدین میں شامل تھا۔ 1930-31 تک وہ لاہوری جماعت کے تتبع میں مرزا غلام احمد کو مجدد سمجھتے تھے اور ان کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال نے کئی سال تک قادیان میں تعلیم حاصل کی تھی۔

کرک میں کس کی سمادھی ہے جسے دوبار مسمار کیا گیا؟

تحریر: اے وسیم خٹک

کرک کی سمادھی ایک بار نہیں بلکہ دوبار مسمار کی گئی ہے۔اس کی کیا وجہ ہے اور یہ سمادھی ہے کس کی؟

تین دن پہلے خیبر پختونخوا کے ضلع کرک کے تاریخی قصبے ٹیری میں ہندوؤں کے متبرک مقام گرو پرماہنس کے سمادھی کو مسمار کر دیا گیا، لیکن یہ اس سمادھی کے لیے مسماری کا پہلا واقعہ نہیں تھا۔

کہتے ہیں کہ کوئی بھی واقعہ اکیلا پیش نہیں آتا، اس کا کوئی نہ کوئی ماضی اور پس منظر ہوتا ہے۔ آیئے ہم اس واقعے کو تاریخ کے تناظر میں دیکھتے ہیں، لیکن سب سے پہلے یہ وضاحت کہ سمادھی ہوتی کیا ہے۔ 'سمادھ' سنسکرت زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہے مراقبہ کرنا۔ جہاں سادھو سنت بیٹھ کر گیان دھیان کرتے تھے اور خدا سے لو لگاتے تھے، اس جگہ کو سمادھی کہا جانے لگا۔ جب یہ سادھو مرتے تھے تو انہیں یہیں دفن کر دیا جاتا تھا، اس لیے سمادھی کا ایک مطلب مزار یا قبرستان بھی ہو گیا۔ ٹیری گاؤں میں گرو پرماہنس کا مزار ہے، جس کی وجہ سے اس مقام کو سمادھی کہا جاتا ہے۔ اس سمادھی سے ملحقہ مندر بھی ہے۔ آج پورے ضلع میں ایک بھی ہندو نہیں، نہ ہی کسی دوسری اقلیت کی کوئی آبادی ہے، لیکن ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ تقسیم سے قبل ٹیری قصبے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور آس پاس کے علاقے میں بھی بہت سے ہندو آباد تھے۔ یہاں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا بازار قائم تھا جو کہ آج بھی موجود ہے۔ تقسیم سے قبل ٹیری کے باسیوں میں ہندوؤں کے ایک مذہبی پیشوا بھی تھے جنہیں گرو پرماہنس کہا جاتا تھا۔ گرو نے بازار کے ساتھ ایک آشرم قائم کر رکھا تھا جہاں پر برصغیر پاک و ہند کے دور دراز علاقوں سے ہندو علم حاصل کرنے آتے تھے۔ علاقے کے لوگوں کے مطابق گرو پرماہنس ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور انہیں اسلام کے متعلق بھی بہت معلومات تھیں، بلکہ بعض لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ گرو پرماہنس حافظ قران بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بڑی تعداد بھی ان کے آشرم پر حاضر ہوتی تھی۔ گرو بیماروں کے تعویذ لکھتے تھے اور دعائیں دیتے تھے۔ گرو پرماہنس 1919 میں ٹیری میں فوت ہوئے۔ ہندو عام طور پر اپنے مردے جلاتے ہیں، لیکن گرو کی وصیت کے مطابق انہیں اسی آشرم کے احاطے میں دفن کر دیا گیا اور ان کی قبر کے اوپر ایک مقبرہ بھی تعمیر کر دیا گیا۔ اسی کو سمادھی کہا جانے لگا۔ اس کے بعد ہندو دور دراز کے علاقوں سے گرو کی زیارت کے لیے سمادھی پر آتے، سنگ مرمر سے بنی ہوئی اس قبر کو غسل دیتے اور یہاں پر منتیں مانگتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اس سمادھی کے ساتھ ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔

یہ سلسلہ قیام پاکستان تک جاری رہا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کی مقامی ہندو آبادی بھارت منتقل ہو گئی اور آشرم سمیت ہندوؤں کی جائیدادوں کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے حصے میں آ گیا۔ ہماری تحقیقات کے مطابق اس آشرم کے علاوہ ٹیری میں پانچ مندر تھے جس میں ایک مندر کی جگہ موجودہ ڈاک خانہ اور دوسرے مندر کی جگہ موجودہ لڑکوں کا پرائمری سکول قائم ہیں، جبکہ دیگر مندروں کا نام ونشان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مٹ چکا ہے۔ البتہ یہ سمادھی باقی رہی کیوں کہ گرو پرماہنس اس کے پیروکاروں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور ان کے 117 ٹرسٹ چل رہے ہیں۔ یہ سمادھی 1997 تک قائم رہی۔ گاؤں ٹیری ہی کے ایک شخص کو ہندوؤں نے اس کا چوکیدار مقرر کر رکھا تھا اور اسے باقاعدہ اس کام کی تنخواہ ملتی تھی۔ مزید یہ کہ جب ہندو زیارت کے لیے آتے تو اسے کچھ نہ کچھ دے کر جاتے تھے۔

پھر کسی وجہ سے اس کی تنخواہ بند ہو گئی۔ وہ سیدھا مولویوں کے پاس چلا گیا اور انہیں کہا کہ ہندوؤں کے عزائم ٹھیک نہیں ہیں وہ یہاں پر مندر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر ایک سیاسی و مذہبی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک بااثر مولوی صاحب نے عوام کو اشتعال دلایا اور 1997 میں گرو پرماہنس کی سمادھی اکھاڑ دی گئی۔

اس وقت کے قومی اسمبلی کے تھرپارکر سے منتخب ہونے والے رکن ڈاکٹر رمیش

کرکٹ کے لٹل ماسٹر حنیف محمد کے کارنامے

اگر ڈکشنری میں لٹل ماسٹر حنیف محمد کا نام شامل ہوتا تو صرف تین الفاظ میں اس کے معنی لکھے ہوئے ہوتے: انہماک، دلیری اور ثابت قدمی۔

حنیف محمد نے اپنے کریئر میں کوئی بھی اننگز اپنی ذات کے لیے نہیں کھیلی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میرے پاس ہر سٹروک موجود تھا لیکن دفاعی انداز اختیار کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میرے ملک کو اس کی ضرورت تھی اور میرے کپتان بھی یہی چاہتے تھے کہ میں بولرز کے سامنے دیوار بن کر کھڑا رہوں۔ پاکستان کی ٹیسٹ کرکٹ کے ابتدائی دور میں کمنٹری کرنے والے جمشید مارکر کہتے تھے 'حنیف محمد جب بیٹنگ کرنے جاتے تھے تو ہم کانپتے تھے، دل میں دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر وہ آؤٹ ہو گئے تو سمجھ لیں کھیل ختم۔ پوری ٹیم ان ہی پر بھروسہ کیا کرتی تھی۔ یوں تو حنیف محمد کی ہر اننگز میں ان کے مضبوط اعصاب جھلکتے ہیں، لیکن دو اننگز ایسی ہیں جو استقامت اور غیر معمولی انہماک کی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ ایک 499 رنز کی اننگز جو 35 سال تک فرسٹ کلاس کرکٹ کی سب سے بڑی انفرادی اننگز کا عالمی ریکارڈ رہی اور دوسری 337 رنز کی اننگز جو ٹیسٹ کرکٹ میں وقت کے اعتبار سے آج بھی سب سے طویل اننگز کے عالمی ریکارڈ کے طور پر موجود ہے۔ اس اننگز میں انھوں نے 970 منٹ (16 گھنٹے سے کچھ زائد) بیٹنگ کی تھی حالانکہ وہ خود کہتے تھے کہ انھیں اس اننگز کی کمنٹری کا جو گراموفون ریکارڈ تحفے میں دیا گیا تھا، اس میں کمنٹیٹر نے یہ وقت 999 منٹ بتایا ہے۔ آٹھ جنوری 1959 کو قائدِ اعظم ٹرافی کا سیمی فائنل کراچی کے پارسی انسٹیٹیوٹ (کے پی آئی) گراؤنڈ میں کراچی اور بہاولپور کی ٹیموں کے درمیان شروع ہوا تھا۔ بہاولپور کو پہلی اننگز میں 185 رنز پر آؤٹ کرنے کے بعد کراچی نے پہلے دن کا اختتام بغیر کسی نقصان کے 59 رنز پر کیا۔ حنیف محمد 25 رنز پر کریز پر تھے۔ دوسرے دن انھوں نے ڈبل سنچری مکمل کی اور جب کھیل ختم ہوا تو وہ 255 رنز پر ناٹ آؤٹ تھے۔ تیسرے دن کے کھیل کے آخری اوور میں ان کی 499 رنز کی اننگز اختتام کو پہنچی تھی۔

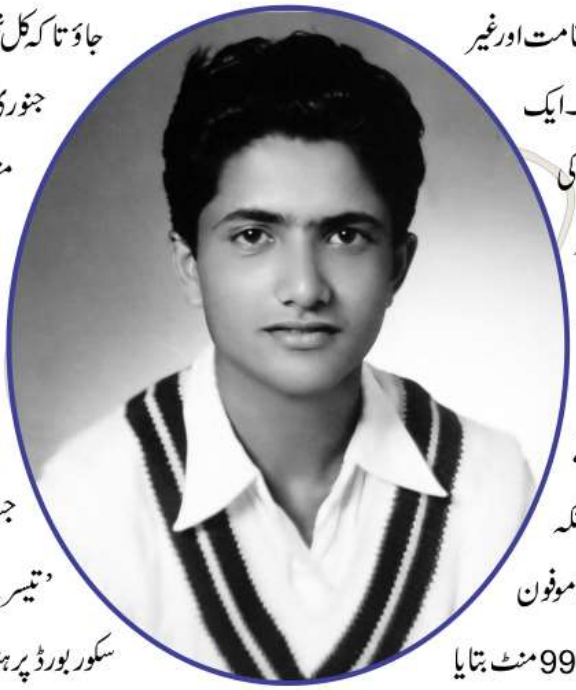

بڑے بھائی کی ورلڈ ریکارڈ پر نظر تھی

حنیف محمد نے بی بی سی اردو کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں اس اننگز سے متعلق پرانی یادوں کو اس طرح تازہ کیا تھا۔ 'جب میری ٹرپل سنچری مکمل ہوئی تو وزیر بھائی، جنھیں ریکارڈز کے بارے میں بہت زیادہ معلومات ہوا کرتی تھیں اور اسی لیے ہم سب انھیں وزڈن کہتے تھے، مجھے کہنے لگے کہ اب تمہیں سرڈان بریڈمین کے 452 رنز کا ریکارڈ توڑنا ہے جس پر میں نے انھیں کہا کہ ابھی تو وہاں تک پہنچنے کے لیے کافی رنز باقی ہیں اور یہ بہت مشکل ہوگا۔ وزیر بھائی کہنے لگے میں تمہیں بڑے بھائی اور کپتان دونوں حیثیت میں حکم دے رہا ہوں کہ تم اس ریکارڈ کو ذہن میں رکھ کر کھیلو۔'

حنیف محمد کا کہنا تھا 'وزیر بھائی کو بخوبی اندازہ تھا کہ میں لمبی اننگز کھیلتے ہوئے تھک چکا ہوں لہٰذا انھوں نے میرے ہاتھوں اور پیروں کی مالش کروائی اور تلقین کی کہ جلد سو جاؤ تاکہ کل تم تازہ دم ہو کر بیٹنگ کر سکو اور عالمی ریکارڈ بناؤ۔' گیارہ جنوری کو حنیف محمد نے سرڈان بریڈمین کا یہ ریکارڈ توڑا تو یہ منظر دیکھنے والوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ حنیف محمد بتاتے تھے 'ٹرپل سنچری کی خبر اخباروں میں شائع ہونے کی وجہ سے بھی اگلے روز کافی لوگ گراؤنڈ میں آئے تھے۔'

حنیف محمد کی یہ اننگز غلط فہمی کی وجہ سے اختتام کو پہنچی تھی جس کی تفصیل خود انھوں نے اس طرح بیان کی تھی: 'تیسرے دن کا آخری اوور تھا۔ اس زمانے میں گراؤنڈ میں سکور بورڈ پر ہندسے ہاتھ سے تبدیل کیے جاتے تھے اور یہ ذمہ داری چھوٹے لڑکوں کے سپرد ہوتی تھی۔' 'میں نے سکور بورڈ دیکھا تو اس پر میرا سکور 496 درج تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وزیر بھائی اس اوور کے بعد اننگز ڈکلیئر کر دیں گے، لہٰذا میں نے ریاض محمود کی پانچویں گیند پر دو رنز لے کر سٹرائیک اپنے پاس رکھنے کا سوچا، تاکہ آخری گیند پر مزید دو رنز لے کر اپنے 500 رنز مکمل کر سکوں۔' 'پانچویں گیند پر پوائنٹ پوزیشن پر مس فیلڈنگ ہوئی اور میں ایک رن مکمل کرنے کے بعد دوسرے رن کے لیے دوڑ پڑا لیکن محمد اقبال کی تھرو وکٹ کیپر تنویر حسین کے پاس میرے پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ گئی اور میں رن آؤٹ ہو گیا۔' جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے سکور بورڈ پر اپنا سکور 499 دیکھا، تو مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ جب میں نے پانچویں گیند کھیلی تھی تو اس وقت میرا سکور 496 نہیں، بلکہ 498 تھا۔ اگر اس وقت بورڈ پر یہ سکور صحیح لگا ہوتا تو میں

پانچویں گیند پر خطرہ مول لینے کے بجائے آخری گیند کا انتظار کرتا اور اس پر دو رنز لے کر 500 رنز مکمل کر سکتا تھا۔' حنیف محمد کے اس عالمی ریکارڈ کو یاد رکھنے کے لیے کے پی آئی گراؤنڈ کے پویلین کی دیوار پر ایک یادگاری تختی نصب کی گئی تھی جس پر ان کی اس اننگز کی تفصیل درج ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اس تختی کے کئی الفاظ صاف دکھائی نہیں دیتے۔ حنیف محمد کے 499 کے عالمی ریکارڈ کو 35 سال بعد برائن لارا نے 1994 میں وارکشائر کی طرف سے ڈرہم کے خلاف 501 رنز بنا کر توڑا تھا۔

وہ تماشائی جو بعد میں پاکستانی کوچ بنا

حنیف محمد نے جب 499 کی اننگز کھیلی تو اس وقت کے پی آئی گراؤنڈ میں موجود شائقین میں ایک 11 سالہ انگریز لڑکا بھی تھا جسے اس کے والد گراؤنڈ میں چھوڑ کر اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ دراصل یہ فیملی عراق میں خراب حالت کی وجہ سے پاکستان آ گئی تھی اور اس لڑکے کے والد یہاں ملازمت کر رہے تھے۔ شام کو جب اس لڑکے کے والد اسے لینے کے لیے گراؤنڈ میں آئے تو اس سے پوچھا کہ آج کھیل میں کیا ہوا، جس پر اس لڑکے نے جواب دیا 'مجھے نام تو معلوم نہیں لیکن ایک بیٹسمین نے 499 رنز کی اننگز کھیلی ہے۔' یہ لڑکا بعد میں انگلینڈ کا ٹیسٹ کرکٹر بنا جسے دنیا باب وولمر کے نام سے جانتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب برائن لارا نے حنیف محمد کا ریکارڈ توڑا تو اس وقت باب وولمر وارک شائر کے کوچ تھے اور برائن لارا نے ڈریسنگ روم میں ان سے معلوم کیا تھا کہ فرسٹ کلاس کرکٹ کی سب سے بڑی اننگز کا ریکارڈ کیا ہے۔

درخت سے گرنے والا تماشائی

حنیف محمد نے جب جنوری 1958 میں ویسٹ انڈیز کے خلاف برج ٹاؤن ٹیسٹ میں 337 رنز کی یادگار اننگز کھیلی تھی تو اس دوران بھی ان کے ساتھ متعدد دلچسپ واقعات پیش آئے تھے۔ حنیف محمد بتاتے تھے 'گراؤنڈ کے باہر بھی کئی لوگ درختوں پر چڑھ کر میچ دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نیچے گر پڑا اور اسے زخمی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔' دو روز بعد جب وہ ہسپتال سے باہر آیا اور گراؤنڈ کے باہر اسی درخت کے پاس آ کر لوگوں سے پوچھا کہ کیا حنیف محمد اب بھی بیٹنگ کر رہے ہیں؟ جواب ملا ہاں۔ یہ سنتے ہی وہ دوبارہ درخت پر چڑھ گیا۔ بعد میں پاکستانی ٹیم کے منیجر نے اس شخص کو گراؤنڈ کے اندر بلوا لیا تاکہ وہ آرام سے میچ دیکھ سکے۔

کاردار کے رقعے

حنیف محمد بتاتے تھے 'جب میں بیٹنگ کر کے اپنے ہوٹل کے کمرے میں آتا تو ہر روز کپتان عبدالحفیظ کاردار کا رقعہ وہاں موجود ہوتا تھا، جس پر میری ہمت بڑھانے والے فقرے درج ہوا کرتے تھے، مثلاً 'تم میچ بچا سکتے ہو'، یا 'تم میچ بچانے کی آخری امید

ہو'۔ ان کا آخری پیغام کچھ اس طرح تھا 'تم نے چائے کے وقفے تک کریز پر رہنا ہے، تب ہم میچ بچا لیں گے۔'

سیٹی بجانے والا بولر

حنیف محمد جب بیٹنگ کر رہے تھے تو اپنا پہلا ٹیسٹ کھیلنے والے فاسٹ بولر ایرک اٹکنسن نے ان کی توجہ ہٹانے کے لیے سیٹی بجانی شروع کر دی جس پر حنیف محمد نے امپائرز سے شکایت کی کہ وہ اٹکنسن کو کہیں کہ وہ سیٹی بجانا بند کر دیں۔ امپائرز کے کہنے پر اٹکنسن نے ایسا ہی کیا، لیکن تھوڑی دیر بعد حنیف محمد کو شاید ماحول میں خاموشی پسند نہیں آئی اور انھوں نے ایرک اٹکنسن سے کہا کہ آپ سیٹی بجا سکتے ہیں۔

مالشیے کی سونے کی عادت

حنیف محمد نے اپنی کتاب پلیئنگ فار پاکستان میں لکھا ہے اس طویل اننگز کے دوران جب بھی میں سیشن ختم ہونے پر ڈریسنگ روم میں آتا تو ٹیم کا مقامی مالشیا سو رہا ہوتا، اسے جگایا جاتا اور پھر وہ میرے جسم کی مالش کرتا۔ میرے ساتھی کھلاڑیوں نے اس سے پوچھا کہ تم حنیف محمد کی بیٹنگ دیکھنے کے بجائے کیوں سوتے رہتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ بولرز حنیف محمد کو آؤٹ نہیں کر سکتے تو پھر میں کیوں نہ آرام کر لوں۔'

شعیب محمد بھی برج ٹاؤن میں

سنہ 1988 میں پاکستانی کرکٹ ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے میں برج ٹاؤن باربڈوس میں ٹیسٹ کھیل رہی تھی۔ اس ٹیسٹ کی دونوں اننگز میں شعیب محمد نے نصف سنچریاں بنائیں۔ یہ وہی میدان ہے جہاں ان کے والد حنیف محمد نے 337 رنز بنائے تھے۔ شعیب محمد کہتے ہیں 'مجھے بہت زیادہ خوشی تھی کہ میں اسی گراؤنڈ میں ٹیسٹ میچ کھیل رہا تھا جہاں میرے والد نے یادگار اننگز کھیلی تھی۔' وہ کہتے ہیں کہ میں پاکستان کی دونوں اننگز میں 54 اور 64 رنز بنا کر ٹاپ سکورر رہا تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں سنچری بناؤں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔' شعیب محمد کے مطابق اس میچ میں اگر امپائرنگ خراب نہ ہوتی تو ہم وہ ٹیسٹ اور سیریز بھی جیت جاتے اور میری کارکردگی مزید نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی۔' (بشکریہ بی بی سی)

سر ایڈورڈ ڈگلس میکلیگن، علامہ اقبال اور سر کا خطاب

تحریر: لیاقت علی

پرانی انارکلی چوک (لاہور) سے نابھہ روڈ سے گذرتے ہوئے کسٹم ہاوس کے قریب جو چوک ہے وہ اے۔جی آفس چوک کہلاتا ہے۔اس چوک سے دائیں ہاتھ جو سڑک جین مندر کو جاتی ہے وہ ایک وقت میں ایڈورڈ روڈ کہلاتی تھی لیکن سڑکوں اور شہروں کے نام بدلنے کا جو چلن شروع ہوا تو اس کا اسلامی نام موج دریا روڈ رکھ دیا گیا۔اگر اسی اے۔جی۔آفس چوک سے بائیں ہاتھ مڑ جائیں تو یہ سڑک میکلیگن روڈ کہلاتی ہے۔

یہ ایڈورڈ اور میکلیگن جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہوتا ہے برطانوی تھے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق برطانوی عہد کی افسر شاہی سے تھا۔لیکن ایک سوال اور بھی ہے کیا یہ ایک ہی شخص تھا یا یہ دو مختلف افراد تھے جن پر ان سڑکوں کے نام رکھے گئے تھے۔ میکلیگن انگریز تھا اور انڈین سول سروس کا اہم رکن۔اس کا پورا نام تھا سر ایڈورڈ ڈگلس میکلیگن۔اس نام سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ ایک شخص تھا جس کے نام کے دو حصوں پر ان دو سڑکوں کے نام رکھے گئے تھے۔میکلیگن برطانوی عہد میں نہ صرف متعدد اہم اور کلیدی عہدوں پر فائز رہا تھا بلکہ پنجاب کی تاریخ کے اہم ترین دور میں تین سال تک پنجاب کا گورنر بھی مقرر ہوا تھا۔میکلیگن کی شخصیت کا ایک اور حوالہ جسے ہمارے ہاں اگر بھلایا نہیں گیا تو نظر انداز ضرور کر دیا گیا ہے وہ ہے علامہ اقبال سے اس کا تعلق اور انگریز سرکار کی طرف سے علامہ کو ملنے والا سر کے خطاب میں اس کا کردار۔لیکن اس سے پہلے کہ ہم علامہ اقبال کو ملنے والے سر کے خطاب میں میکلیگن کے رول کی بابت کچھ بات کریں ضروری ہے کہ میکلیگن کی شخصیت اور بطور سول سرونٹ اس کے کیئر یر کا تعارف کرا دیا جائے۔سر ایڈورڈ ڈگلس میکلیگن ((1864-1952 کا تعلق برطانوی سرکاری افسروں کی اس نسل سے تھا جو برطانیہ کی بجائے ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی تھی۔یہ وہ نسل تھی جس کے والدین برطانوی فوج یا سول سروس میں ملازمت کی بدولت سالہا سال سے ہندوستان میں مقیم تھے۔ایڈورڈ گلس میکلیگن بھی رائل انجینئر نگ سروس میں تعینات جنرل میکلیگن کے ہاں 1864 میں پیدا ہوا تھا۔ جنرل میکلیگن کی پنجاب میں تعیناتی کی بدولت ایڈورڈ کا بچپن پنجاب میں گذرا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے ونچسٹر کالج اور نیو کالج آکسفورڈ سے تعلیم مکمل کر کے 1883 میں انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا تھا۔سنہ 1881 میں ہونے والی پہلی مردم شماری سر ایڈورڈ ڈگلس میکلیگن کی زیر نگرانی مکمل ہوئی تھی۔ڈگلس نے پنجاب کی ذاتوں اور قبیلوں پر ایک مبسوط کتاب مرتب کی تھی جس میں اس نے سر ڈینزل ابسن کی اس موضوع پر لکھی کتاب سے بھی استفادہ کیا تھا۔ 1906 میں وہ پنجاب کا چیف سیکرٹری اور 1910 میں مرکزی حکومت کا سیکرٹری ایجوکیشن اور بعد ازاں سیکرٹری ریونیو مقرر ہوا تھا۔میکلیگن کو 1919 میں مائیکل اوڈوائیر کی جگہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب مقرر کیا گیا تھا۔پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اوڈوائر جلیانوالہ باغ کے اندوہناک واقعہ کا ذمہ دار تھا کیونکہ اس واقعہ کی منصوبہ بندی لاہور کے گورنر ہاوس میں اسی کی زیر نگرانی کی گئی تھی۔میکلیگن جب گورنر پنجاب مقرر ہوا اس وقت پنجاب میں سیاسی بے چینی شدید تھی۔جلیانوالا باغ کے قتل عام کی بنا پر پنجاب بھر میں غم و غصے کی زبردست لہر دوڑ چکی تھی اور لوگوں کی ناراضی دور کرنے کے لئے ہی مائیکل اوڈوائیر کو گورنر پنجاب کے عہدے سے ہٹا کر میکلیگن کو مقرر کیا گیا تھا۔

میکلیگن بطور گورنر پنجاب یونینسٹ پارٹی قائم کرنے میں سر فضل حسین کی مدد و تعاون فراہم کیا تھا۔یونینسٹ پارٹی پنجاب کے جاگیرداروں کی ایسی سیکولر پارٹی تھی جس میں مسلمان، ہندو اور سکھ جاگیردار شامل تھے۔کسانوں اور دیہی عوام کے مفادات کے تحفظ کے نام پر تشکیل پانے والی یونینسٹ پارٹی دراصل جاگیرداروں کے تحفظ کے لئے بنائی گئی تھی۔میکلگین کے عہد گورنری ہی میں پنجاب میں محدود الیکشن ہوئے اور پہلی مرتبہ دو وزرا پر مشتمل کابینہ بنائی گئی تھی۔اس کابینہ میں سر فضل حسین وزیر تعلیم اور سر کشن لعل وزیر زراعت مقرر ہوئے تھے۔سر ایڈورڈ ڈگلس میکلیگن نے بطور گورنر لاہور میں دو ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جو نہ صرف آج بھی قائم ہیں بلکہ دونوں اب یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔1923 میں میکلیگن نے مغل پورہ ٹیکنیکل کالج کی بنیاد رکھی جس کو بعد ازاں میکلیگن انجینئر نگ کالج کا نام دیا گیا تھا۔آج ہم اسے یونیورسٹی آف انجینئر نگ اینڈ ٹیکنالوجی کے نام سے جانتے ہیں۔اسی میکلیگن کالج کا ایک حصہ پنجاب انجینئر نگ کالج کے نام بھارتی پنجاب کے دارالحکومت چندی گڑھ میں قائم ہے۔1924 میں بطور گورنر اپنی سبک دوشی سے قبل میکلیگن نے لاہور کالج فار ویمن کی بنیاد رکھی جو آج یونیورسٹی بن چکی ہے۔یہ دونوں تعلیمی ادارے میکلیگن کو یاد رکھنے کے لئے کافی ہیں۔اب علامہ اقبال، ان کو ملنے والا سر کا خطاب اور گورنر میکلیگن کے تعلق کا کچھ ذکر۔جس دور میں علامہ اقبال کو سر کا خطاب ملا اس دور میں ہندوستان کی سیاست میں انقلابی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو اہم تحریکیں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر ابھر چکی تھیں۔تحریک ترک موالات نے لوگوں زور دیا تھا کہ وہ برطانوی سرکار کے عطا کردہ خطابات اور اعزازی عہدوں کو واپس اور تمام سرکاری اور نیم سرکاری تقریبات

میں شرکت کرنے سے انکار کریں۔ یہی وہ دور تھا جب رابندر ناتھ ٹیگور نے سر کا خطاب یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ وہ اس خطاب کے بغیر اپنے ہم وطنوں میں زندہ رہنا پسند کرتا ہیں۔ لیکن عین اسی زمانے میں انگریز سرکار نے علامہ اقبال کو نائٹ ہڈ (سر) دینے کا فیصلہ کیا۔ سر کے خطاب سے پہلے علامہ اقبال کو پنجاب کورٹ کے چیف جج جسٹس شادی لعل کے ذریعے خان بہادر کے خطاب کی پیش کی جسے علامہ اقبال نے اپنے مقام سے کم تر خیال کرتے ہوئے ٹھکرا دیا تھا۔ بعد ازاں انھیں پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن نے گورنر ہاوس میں مدعو جہاں انھیں لندن ٹائمز کے ایک صحافی سے ملوایا جس نے اقبال کی کتاب اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھا تھا۔ مذکورہ صحافی سے گفتگو کے بعد جب علامہ اقبال رخصت ہونے لگے تو انھیں گورنر کی طرف سے پیغام ملا کہ وہ جانے سے قبل گورنر سے مل لیں۔ جب اقبال گورنر سے ملے تو اس نے کہا کہ میں آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کے لئے نائٹ ہڈ (سر) کے خطاب کی سفارش کرنا چاہتا ہوں آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے جس پر اقبال نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

علامہ اقبال کو سر کا خطاب ملنے کے بعد 17 جنوری 1923 کو مقبرہ جہانگیر میں تقریب پذیرائی منعقد ہوئی تھی جس کا دعوت نامہ گورنر میکلیگن کی انتظامی کونسل کے اراکین جان مینارڈ، میاں فضل حسین، لالہ ہرکشن لعل، نواب سر ذوالفقار علی خان نواب سر فتح علی خان قزلباش، چودھری سر شہاب الدین اور میاں احمد یار خاں دولتانہ جیسے سرکار پرستوں کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ اس جلسے کی صدارت گورنر پنجاب سر ایڈورڈ ڈگلس میکلیگن نے کی تھی۔ تقریب پذیرائی کے رسمی میزبان تو سر ذوالفقار علی خان تھے لیکن اس کو کامیاب بنانے کا سہرا وزیر تعلیم سر فضل حسین تھا جنھوں نے لاہور کے تمام سکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور طالب علموں کی حاضری یقینی بنائی تھی۔ تقریب کا آغاز میزبان سر ذوالفقار علی خان کی تقریر سے ہوا اور ان کے جواب میں علامہ اقبال نے تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ گورنمنٹ نے انھیں خطاب دے کر اردو اور فارسی کے ادیبوں کی عزت افزائی کی ہے۔ دل چسپ امر ہے کہ تقریب کی شرکاء میں اکثریت مقامی افراد کی تھی لیکن اس کے باوجود علامہ اقبال اور سر ذوالفقار علی خان نے اردو کی بجائے انگریزی میں تقریریں کی تھیں۔ اس تقریب کی ایک عجیب بات یہ تھی کہ صدر تقریب گورنر میکلیگن نے کوئی تقریر نہیں کی تھی تقریب کے اختتام پر ایک فوٹو لیا گیا جس میں سر محمد اقبال، سر ایڈورڈ میکلیگن، سر جان مینارڈ، سر ذوالفقار علی خان، راجہ نریندر ناتھ اور دیوان کشن شریک ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کو سر کا خطاب ملنے پر ان کے ایک عقیدت مند مولانا ظفر علی خان نے لکھا:۔

سرفروشوں کے ہیں ہم سر، آپ ہیں سرکار کے
آپ کا منصب ہے سرکاری، ہمارا خانگی

فیلڈ ہاکی کا بڑا نام 'سہیل عباس'

فیلڈ ہاکی میں سب سے زیادہ گول بنانے والے پاکستان کے مایہ ناز پنالٹی کارنر اسپیشلسٹ سہیل عباس آج اپنی 41 ویں سال گرہ منا رہے ہیں۔ سہیل عباس کو انٹرنیشنل ہاکی چھوڑے 6 سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا لیکن آج تک بھی کوئی کھلاڑی ان کا 348 گولز کا عالمی ریکارڈ نہ توڑ سکا۔ سہیل عباس فیلڈ ہاکی کا بڑا نام ہے، جس نے ہاکی کے میدانوں پر خوب دھوم مچائی، انہوں نے 9 جون 1975 کو ایک اسپورٹس گھرانے میں جنم لیا۔

والد افتخار حسین فرسٹ کلاس کرکٹر تھے، لیکن سہیل نے ہاکی کو اپنایا، کراچی کے معروف اسکول جہاں سے بہت سے بڑے نام پاکستان ہاکی کا حصہ بنے، سہیل عباس بھی ان میں سے ایک ہیں۔ 90ء کی دھائی میں سہیل نے جونیئر کی سطح پر نام بنایا اور پھر نیشنل ٹیم میں مقام پایا، 1998 میں بھارت کے خلاف سیریز سے انٹرنیشنل ڈیبو کیا یہاں سے بلندی کی جانب سفر شروع ہوگیا۔ اسی سال اذلان شاہ ہاکی ٹورنامنٹ میں سب سے زیادہ 20 گول بنائے اور پاکستان کو پہلی مرتبہ ایونٹ کا فاتح بنوایا۔ بہت ہی کم عرصے میں سہیل نے گولز کا عالمی ریکارڈ بھی بنا دیا، آٹھ اکتوبر 2004ء سہیل ان کے لیے یادگار دن تھا جب چیمپینز ٹرافی کے میچ میں سہیل عباس نے 268 واں گول بنا کر ہالینڈ کے پال لیٹجن کو عالمی ریکارڈ سے محروم کر دیا۔

ایک کلینڈر ائیر میں سہیل 60 گول کرنے والے واحد کھلاڑی ہیں، ڈھائی سال میں گولز کی فاسٹ سنچری اور 5 سال 5 ماہ میں فاسٹ ڈبل سنچری بھی سہیل ہی کے نام درج ہے۔ سہیل عباس کا 21 ہیٹ ٹرک کے ساتھ انٹرنیشنل ہاکی میں 348 گولز کا ریکارڈ آج بھی قائم ہے۔

بلوچستان کا ہزاروں سال قدیم پنوں قلعہ عدم توجہ کا شکار

سسی پنوں کی مشہور لوک داستان میں بھی اس قلعے کا ذکر ملتا ہے، مگر اب یہ مٹی کا ڈھیر بنتا جا رہا ہے۔

تحریر: ظریف بلوچ (از طرف نمائندہ لاہور انٹرنیشنل بلوچستان)

بلوچستان کی سرزمین پر وادی کیچ کو قدیم تہذیب اور ثقافت کی امین سمجھا جاتا ہے۔ کیچ پنوں کا سرزمین بھی کہا جاتا ہے، یہاں قدیم تاریخ، تہذیب وتمدن کے ہزاروں سال قبل کے ثقافتی ورثے پائے جاتے ہیں، جن کا کھوج لگانا اب بھی باقی ہے۔

ماضی میں وادی کیچ کو فتح کرنے کے لیے کئی جنگیں لڑی گئی ہیں۔ اس سرزمین پر مختلف ادوار میں مختلف قوموں نے حکمرانی کی ہے۔ کیچ کے زرخیز سرزمین میں قدیم تہذیب کے آثار اور باقیات اب بھی موجود ہیں جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہزاروں سال قبل بلوچستان کی یہ وادی نہایت اہمیت کی حامل تھی اور یہاں کے باسی ہنرمند تھے۔ 'میری قلات' کیچ کے شمال مغرب کی طرف تربت سے تقریباً 10 سے 12 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم اور تاریخی مقام ہے۔ ایک اونچے ٹیلے پر بنے ہوئے بڑے قلعے کے آثار اور باقیات کھنڈرات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ عدم توجہ کے باعث وقت گزرنے کے ساتھ مقامی طور پر 'میری قلات' اور 'پنوں قلات' کے نام سے جانے جائے والے اس تاریخی اور قدیم قلعے کے آثار اور باقیات کھنڈرات کی شکل میں رہ گئی ہیں۔ قلعے کی دیواروں اور برجوں کی باقیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہونے کی وجہ سے اس قلعے کی پرانی دیواریں چھپی ہوئی ہیں۔ غالب امکان یہ ہے کہ 10 میٹر اونچائی تک عمارتیں ہزاروں سال پہلے رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ اس وقت صرف قلعے کے اوپری حصے کی باقیات اور آثار با آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ جبکہ مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے اس قلعے کی تعمیر میں لکڑیوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ قریب جانے سے قلعے کی چھتوں پر لکڑی بھی نظر آتی ہے۔

قلعے کے احاطے میں تین کنوؤں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہزاروں سال قبل یہاں کے لوگ سنگ تراشی اور مٹی سے قلعہ بنانے کے ہنر سے خوب واقف تھے۔ یہ قلعہ مٹی اور پتھروں سے بنایا گیا ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ پتھر اور مٹی دریائے کیچ کور سے لیے گئے ہیں، کیونکہ دریائے کیچ 'میری قلات' کے قریب سے گزرتا ہے۔ قلعے کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ بنانے کے لیے چاروں طرف مورچے قائم کیے گئے تھے اور آثار سے نظر آتا ہے کہ ان مورچوں کے ذریعے قلعے کی حفاظت ہوتی تھی۔ اس قلعے کے چاروں اطراف بنے مورچوں کے نشانات کے آثار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں جبکہ قریب کھجوروں کے باغات ہیں۔ اس قلعے کی کھدائی سے کم وبیش یہاں پر 2700 قبل مسیح سے الگ بھگ سو سال قبل تک مسلسل قبضے کے شواہد سامنے آتے ہیں۔ تربت سے تعلق رکھنے والے مقامی لکھاری نعیم شاد کے مطابق 'میری' بلوچی زبان کے لفظ 'میر' سے نکلا ہے اور میر کی وجہ سے اس کو میری قلات یعنی میر کا قلات کہا جاتا ہے۔ 12 ویں صدی میں اس علاقے میں میر جلال خان ہوت حاکم تھے، اور مقامی روایت سے سسی اور پنوں کی داستان سے اس قلعے پر ہوت قبیلہ کی حکمرانی کو تقویت ملتی ہے۔ یونیورسٹی آف بلوچستان سے شعبہ آرکیالوجی کے استاد عمران شبیر نے انڈیپنڈنٹ اردو کے رابطہ کرنے پر بتایا کہ اس قلعے میں 12 مختلف ادوار سے لوگ آباد تھے اور یہ 5500 سے 6000 سال پرانا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کھدائی میں مٹی کی رنگت سے مختلف ثقافتوں کو شناخت کیا جاتا ہے، سب سے قدیم ثقافت قلعے کے نیچے کی مٹی سے شناخت ہوتی ہے اور اوپری مٹی سے آخری ثقافت کو شناخت کیا جاتا ہے، اور تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہاں 12 مختلف بادشاہ اور ثقافتوں کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ غالب امکان یہ ہے کہ اس تاریخی قلعے میں مختلف ادوار میں مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کا راج تھا، جن کو اپنے ادوار میں غیر مشروط طاقت حاصل تھی۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس سرزمین پر منگول، عرب، یونانی اور غزنوی مختلف ادوار میں حاکم رہے ہیں جبکہ اس حوالے سے کوئی تاریخی دستاویزات موجود نہیں ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ اس بات پر متفق ہیں کہ ہزاروں سال قبل اس قدیم قلعے میں کئی اقوام اور ثقافتوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ بلوچی لوک داستان اور شعری میں موجود سسی پنوں کے عشقیہ داستان سے اس قلعے کے ماضی کے بارے کے صرف ایک حصے کے بارے میں معلومات ملتی ہے اور باقی 11 ادوار کے حوالے سے تاریخی دستاویزات اب تک غائب ہیں۔

مقامی لوک داستانوں اور شاعری کے مطابق 12 ویں صدی میں اس قلعے پر میر جلال خان ہوت حاکم تھے۔ مقامی لوک داستانوں کے مطابق میر دوستین ہوت (پنوں) میر عالی کے بیٹے تھے۔ میر عالی حاکم کیچ میر محمد موت کے صاحبزادے تھے اور یہ میر جلال خان ہوت کے پوتے تھے۔ میر جلال خان ہوت قبیلے کا سربراہ اور حاکم کیچ تھے، اور اس قبیلے کے لوگ اب بھی تربت سمیت مکران کے مختلف علاقوں میں رہائش پذیر ہیں۔ (مقامی روایت کے مطابق سرزمین کیچ کے حاکم میر عالی کا بیٹے میر دوستین

ہوت (پنوں) تجارت کی غرض سے کیچ سے سندھ کے شہر بھنبھور چلے گئے اور سسی کے عاشق ہوئے۔ سسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھنبھور کے راجہ کی بیٹی تھی اور ان کی پیدائش پر جوتشیوں نے راجا کو کہا کہ یہ لڑکی شاہی خاندان کے لیے بدشگونی کی علامت ہے۔ بھنبھور کے راجہ نے لڑکی کو ایک لکڑی کے صندوق میں ڈال کر دریائے سندھ کی لہروں کے حوالے کر دیا اور اتفاقاً صندوق بھنبھور کے گاؤں کے ایک بے اولاد دھوبی کے ہاتھ لگا جس نے لڑکی کو خدا کا عطیہ سمجھ کر اپنی اولاد کی طرح پالا۔

کیچ کے حاکم کے بیٹے میر دوستین ہوت کو بھنبھور کے ایک دھوبی کی بیٹی سسی سے عشق ہو گیا اور دھوبی بننے کی شرط پر پنوں سسی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ پنوں کا خاندان اس رشتے پر برہم تھا اور پنوں سے ملنے کے بہانے بھنبھور آئے اور نشہ آور مشروبات پلا کر پنوں کو اپنے ساتھ واپس کیچ ساتھ لے گئے۔ جب صبح سسی خواب سے جاگی تو پنوں کو نہ پا کر دیوانہ ہو کر کیچ کی طرف نکلیں، تپتے صحرا میں پیاس کی شدت سے نڈھال سسی نے ایک چرواہے سے پانی مانگا اور چرواہے کی بدنیتی کو بھانپ کر حسرت بھرے نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی اور دعا مانگی۔ اسی اثنا زمین پھٹی اور سسی زمین کے اندر چلی گئیں۔ جب پنوں کو ہوش آیا تو سسی کو نہ پا کر وہ سسی سسی پکارتے ہوئے کیچ سے بھنبھور کی طرف بھاگا اور راستے میں اسی جگہ پر اس کی ملاقات اسی چرواہے سے ہوئی۔ چرواہے نے پنوں کو سارا ماجرا سنایا تو وہ سسی سسی کہہ کر چلایا۔ جواباً سسی کی کرب ناک آواز ابھری، قبر شق ہوئی اور پنوں سسی سے جا ملا۔

محبت کی اس لازوال داستان سسی پنوں کی قبریں بلوچستان کے ضلع لسبیلہ میں موجود ہیں جہاں عقیدت مند زیارت کے لیے آتے جاتے ہیں۔ ایک فرانسیسی ٹیم نے حالیہ برسوں میں اس سائٹ سمیت مکران میں موجود دیگر قلعوں کی کھدائی کی اور کھدائی میں ماہرین کو مختلف ادوار کے آثار ملے، جبکہ اطالوی ماہرین آثار قدیمہ بھی ماضی میں اس قلعے کی کھدائی کرتی رہی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق کھدائی سے پہلے تحفظ اور انتظام کے مربوط اور جامع منصوبہ بندی کے بغیر اس کی کھدائی ممکن نہیں۔ عمران شبیر کے مطابق اس قلعے کو دوبارہ اپنی اصلی شکل میں لانا تو ممکن نہیں البتہ جن اشیاء سے یہ قلعہ بنایا گیا تھا انہی سے اس جیسا ایک قلعہ بنایا جا سکتا ہے تاکہ قدیم تہذیب اور آثار کو محفوظ کیا جا سکے۔ دو سال قبل حکومت نے اس تاریخی قلعے کو بحال کرنے کے لیے غور شروع کر کے اس حوالے سے منصوبہ بندی کی تھی مگر اس پر تا حال کام شروع نہیں ہو سکا۔ عین ممکن ہے کہ آنے والے بجٹ میں اس کے لیے رقوم مختص کی جائے۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق میری قلات کو بحال بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو ایک باڑ لگا کر بند کیا جائے اور اس کی مکمل کھدائی کر کے قلعے کے مختلف ادوار کو شناخت کیا جائے۔

⁂

سسی پنوں

پنوں یا پنہوں: میر پنوں خان (میر دوستین ہوتھ) میر عالی کا بیٹا تھا جو میر ہوتھ خان بلوچستان کے مشہور قبیلے ہوتھ کا سردار تھا۔

سسی: سسی بھمبھور (موجودہ سندھ میں) کے راجا کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش پر جوتشیوں نے راجا کو کہا کہ یہ لڑکی شاہی خاندان کے لیے بدشگونی ہے۔ راجا نے لڑکی کو ایک لکڑی کے صندوق میں ڈال کر دریائے سندھ میں بہا دیا۔ صندوق بھمبھور کے گاؤں کے ایک بے اولاد دھوبی کے ہاتھ لگا، جس نے لڑکی کو خدا کا عطیہ سمجھ کر اپنی اولاد کی طرح پالا۔

سسی جب جوان ہوئی تو اس کی خوبصوتی کے چرچے دور دور تک پھیل گئے۔ پنوں نے جب سسی کے بارے میں سنا تو اس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا، جس پر نوجوان شہزادے نے بھمبھور کا سفر کیا۔ پنوں اپنے کپڑے دھلوانے کے بہانے سسی کے باپ کے پاس آیا جو ایک دھوبی تھا۔ اس کے گھر پر سسی کو پہلی نظر دیکھتے ہی اس کا دیوانا ہو گیا۔ سسی کا باپ سسی کو اپنی ہی ذات میں بیاہنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے پنوں سے یہ ثابت کرنے کو کہا کہ وہ بھی ایک دھوبی ہے۔ شہزادہ چونکہ دھوبیوں کے کام سے ناواقف تھا اس لیے وہ صاف کپڑے دھونے میں ناکام رہا۔ اس کا حل اس نے یوں نکالا کہ ہر کپڑے کے جیب میں اس نے ایک سونے کا سکہ ڈالا دیا۔ جس پر تمام گاؤں والوں نے اس کی دھلائی کی تعریف کی اور یوں سسی کا والد اسے اس سے بیاہنے پر تیار ہو گیا۔

پنوں کے بھائی: پنوں کا والد اور بھائی اس شادی کے خلاف تھے اور اپنے ولد کے کہنے پر پنوں کے بھائی بھمبھور آئے تاکہ اسے اس شادی سے منع کیا جا سکے۔ بھائیوں نے پنوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور دھمکایا میں پنوں کسی طور سے نا مانا تو انہوں نے دوسرا طریقہ اپنایا۔ بظاہر وہ پنوں کی شادی پر رضامند ہو گئے اور پنوں کی شادی میں شریک بھی ہوئے جہاں انہوں نے پنوں کو بہت زیادہ شراب پلائی جس سے وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا۔ وہ لوگ پنوں کو باندھ کے ایک اونٹ پر لاد کر اپنے آبائی علاقے کیچ میں لے آئے۔

انجام: اگلی صبح جب سسی کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے، تو وہ غصے اور غم کی کیفیت میں ننگے پاؤں کیچ مکران کی طرف چل دی۔ سفر میں اسے خشک ریگستان سے گزرنا پڑا مگر اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ تمام سفر میں وہ پنوں پنوں پکارتی رہی۔ انتہائی پیاس کی حالت میں اسے ایک گڈریا ملا جس نے اسے پینے کو پانی دیا۔ گڈریا کی نیت اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر خراب ہو گئی، سسی وہاں سے بھاگ گئی اور رب سے دعا کی کہ اسے چھپا لے۔ خدا نے اس کی دعا سنی، زمین شق ہوئی اور وہ اس میں سما گئی۔ سسی نے اپنے آپ کو پہاڑوں کی ایک وادی میں دفن پایا۔ اگلے روز جب پنوں کو ہوش آیا تو وہ بھی سسی سسی پکارتے ہوئے بھمبھور کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس کی ملاقات اسی گڈریے سے ہوئی جس نے اسے سارا ماجرا سنایا۔ پنوں نے بھی اپنے رب سے وہی دعا کی اور زمین ایک بار پھر شق ہوئی اور پنوں بھی اس میں سما گیا اور اپنے آپ کو اسی پہاڑوں کی وادی میں دفن پایا جہاں سسی دفن تھی۔ یہ افسانوی قبر آج بھی موجود ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس قصے کو منظوم کیا۔

کیچ مکران: موجودہ دور میں کیچ بلوچستان میں مکران کوسٹل ہائی وے پر واقع ہے۔ پنوں کا پرانا قلعہ یہاں موجود ہے۔

بھیرہ حکومتی توجہ کا منتظر

تحریر: محمد عمران چوہدری

یہ ذکر ہے 1540 کا، جب ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد راہ فرار اختیار کی۔ شیر شاہ کو ہمایوں کے بھیرہ میں قیام کی اطلاع ملی تو وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے بھیرہ آن پہنچا، مگر اس وقت تک شہر کو کھنڈر میں تبدیل کرنے کے بعد ہمایوں جا چکا تھا۔ شیر شاہ نے شہر کو دوبارہ تعمیر کروانے کے ساتھ ایک جامع مسجد بھی تعمیر کروائی، جو آج بھی ان کی یاد دلاتی ہے۔

اگر آپ لاہور سے اسلام آباد موٹروے پر سفر کریں تو نصف مسافت طے کرنے کے بعد بھیرہ انٹرچینج کا بورڈ نظر آئے گا۔ یہاں سے 15 منٹ کی مسافت پر تاریخی شہر بھیرہ واقع ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ بھیرہ 2400 سال قدیم شہر ہے۔ بعض مورخین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ 326 قبل مسیح میں راجہ پورس سے لڑائی کے دوران سکندر اعظم کا گھوڑا بیوس فیلس مارا گیا۔ سکندر نے اس گھوڑے کے نام پر یہ شہر آباد کیا۔ سنسکرت میں بیوس فیلس کو بھیرہ کہا جاتا ہے۔ دریائے جہلم پار کرنے سے پہلے سکندر نے چار روز اس شہر میں قیام کیا۔ تزک بابری میں بھی بھیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

1300 سال قبل لوگ طب اور جغرافیہ کا علم سیکھنے بھیرہ آیا کرتے تھے۔ میراں صاحب جیسے عظیم صوفی جن کے ہاتھوں سیکڑوں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے، آپ کا تعلق بھی بھیرہ سے ہے۔ آج بھی لوگ دور دور سے آپ کے دربار پر حاضری دے کر آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے اس تاریخی شہر کی بدقسمتی ہی کہہ سکتے ہیں کہ سابق چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت پیر کرم شاہ الازہری، سابق وزیر خزانہ احسان الحق پراچہ (مرحوم)، سابق وزیر مملکت مذہبی امور امین الحسنات شاہ، وزیر اعظم عمران خان کے معاون خصوصی ندیم افضل چن اور موجودہ الیکشن کمشنر کا تعلق بھیرہ سے ہونے کے باوجود یہ شہر ایک تاریخی سیاحتی مقام نہ بن سکا اور آج زبوں حالی کا شکار ہے۔ شیر شاہ سوری کے نام سے منسوب تاریخی جامعہ مسجد میں تعمیر و مرمت کا کام سست روی کا شکار ہے۔ نامناسب دیکھ بھال اور محکمہ آثار قدیمہ کی عدم توجہی کی بدولت بھیرہ کے آٹھ تاریخی دروازوں میں سے 4 تاریخ میں گم ہو چکے ہیں۔ ریل سروس بند ہونے کی وجہ سے اب حالت یہ ہے کہ تاریخی ریلوے اسٹیشن کے نشانات تک معدوم ہو رہے ہیں۔ انگریز کے دور سے قائم گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ، جو کبھی وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا، اب دھیرے دھیرے اپنے تابناک ماضی سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ انتظامیہ کی غفلت کی بدولت بھیرہ کے بازار سیاحوں کے لیے نوگو ایریاز بن چکے ہیں۔ اورنگزیب عالم گیر کی تعمیر کردہ حافظانی مسجد ہو، مغلیہ دور کا قائم کردہ ٹکسال، یا پھر بھیرہ کے دیگر تاریخی مقامات، عدم توجہی کی بدولت حوادث زمانہ کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر مناسب اور بروقت توجہ نہ دی گئی تو پاکستان ایک بڑے ثقافتی ورثے سے محروم ہو جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سے پہلے تاریخ، تاریک ہو جائے، بھیرہ کے تاریخی اور ثقافتی ورثے کو محفوظ کیا جائے۔ ٹوٹ پھوٹ کے شکار تاریخی دروازوں کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔ شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ مسجد کی تعمیر و مرمت کی جائے۔ ریل سروس کو بحال یا پھر میوزیم بنا کر محفوظ ہی کر لیا جائے۔ اورنگزیب عالمگیر کی مسجد حافظانی کی مرمت اور تزئین و آرائش کر کے حوادث زمانہ کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔ بھیرہ کے بازاروں کو تجاوزات سے پاک کر کے انہیں وسیع کیا جائے تاکہ سیاحوں کے لیے آسانی پیدا ہو سکے۔ ہندوؤں کی واحد عبادت گاہ کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے بچا کر محفوظ کر لیا جائے۔ شہر میں امن و امان قائم کرنے کے لیے اسے بلاتفریق اسلحہ سے پاک کیا جائے۔ اور آخر میں بھیرہ کے عوام کا ایک دیرینہ اور عصر حاضر کا اہم ترین مطالبہ کہ تحصیل ہیڈ کوارٹر اسپتال میں ایمرجنسی وارڈ کو فعال کیا جائے، کیونکہ موٹروے پر آئے روز حادثات معمول بن چکے ہیں، اور بدقسمتی سے قریب ترین اسپتال بھیرہ ایمرجنسی سہولیات سے محروم ہے۔ اگر حکومت پاکستان بھیرہ کی بطور ایک تاریخی اور ثقافتی شہر کے مناسب تشہیر کرے تو یہ ایک بڑے سیاحتی مرکز کے طور کثیر زرمبادلہ کمانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بصورت دیگر جلد یہ شہر بھی اپنی تاریخی حیثیت کو گنوا کر تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔

سعودی تیل کی کہانی

تحریر: عارف شمیم

آج سے ٹھیک 94 برس قبل یعنی 11 جنوری 1926 کو مملکت سعودیہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ سعودی عرب کی معیشت کے پھیلاؤ اور وہاں موجود تیل کی دولت کا احاطہ کرتی یہ رپورٹ پہلی مرتبہ ستمبر 2019 کو بی بی سی پر شائع ہوئی تھی جسے آج کے دن کی مناسبت سے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے دو سوال۔ دنیا میں پہلی بار تیل کے لیے کہاں ڈرل کیا گیا تھا؟ اور دوسرا یہ کہ عالمی تخمینوں کے مطابق کس ملک کے پاس خام تیل کے سب سے زیادہ ذخائر موجود ہیں؟

اگر آپ نے ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب سعودی عرب دیا تو آپ غلط ہیں۔

سب سے پہلے تیل چوتھی صدی میں چین میں ڈرل کیا گیا تھا۔ اس ڈرلنگ کے لیے کوئی مشینیں موجود نہیں تھی اس لیے ایسا لمبے لمبے بانسوں کی مدد سے کیا گیا اور کالے رنگ کا چپکنے والا مادہ نکالا گیا جو بعد میں ایندھن کے طور پر استعمال ہوا۔ تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک کے مطابق اس کے ممبران ممالک میں 2018 کے اختتام تک کے اعداد و شمار کے مطابق سب سے زیادہ خام تیل کے ذخائر لاطینی امریکہ کے ملک وینیز ویلا کے پاس ہیں جبکہ دوسرا اور تیسرا نمبر بالترتیب سعودی عرب اور ایران کا ہے۔ وینیز ویلا کے پاس 302.81 بلین بیرل تیل کے ذخائر ہیں جبکہ سعودی عرب کے پاس یہ ذخائر 267.03 بلین بیرل ہیں۔ ایران 155.60 بلین بیرل کے ساتھ تیسرے اور عراق 145.02 بلین بیرل کے ساتھ چوتھے نمبر پر ہے۔ حالیہ اندازوں کے مطابق اوپیک کے پاس دنیا کے تیل کے ذخائر کا 4.79 فیصد حصہ ہے جس میں سے زیادہ تر مشرقِ وسطیٰ میں موجود ہیں۔

سعودی عرب میں تیل کب دریافت ہوا

سعودی عرب میں پہلی مرتبہ تیل مارچ 1938 میں ایک امریکی کمپنی کے اشتراک سے دمام آئل فیلڈ سے 1440 میٹر کی گہرائی سے نکالا گیا۔ یہ امریکی کمپنی سٹینڈرڈ آئل کمپنی آف کیلیفورنیا تھی۔ پہلے اس کا نام کیلیفورنیا اربیئن سٹینڈرڈ آئل کمپنی رکھا گیا جو بعد میں عربیئن امیریکن آئل کمپنی (آرامکو) بن گیا۔ سروے اور ڈرلنگ تو 1935 سے ہی شروع ہو گئی تھی لیکن 1938 میں دمام کے نمبر 7 آئل فیلڈ سے تیل کی پیداوار بھی شروع ہو گئی۔ ریکارڈ کے مطابق 1939 میں پہلا ٹینکر تیل برآمد کرنے کے لیے نکلا اور یہاں سے ہی حقیقت میں سعودی عرب معاشی طور پر پروان چڑھنے لگا۔

آرامکو سعودی آرامکو کب بنا

1949 میں امریکی کمپنیوں کا مجموعہ آرامکو یومیہ 000,500 بیرل خام تیل پیدا کرنے لگا تھا۔ 1958 میں آرامکو نے ایک کیلینڈر سال میں خام تیل کی پیداوار 10 لاکھ بیرل سے زیادہ کر لی اور اس طرح آرامکو کا سعودی عرب کے تیل پر کنٹرول بڑھتا رہا۔ بالآخر 1980 میں سعودی عرب نے فیصلہ کیا کہ امریکی کمپنیوں سے تیل کے سبھی اثاثے خرید لیے جائیں اور اس طرح 1988 میں سعودی عربیئن آیل کمپنی یا سعودی آرامکو کا قیام ہوا۔ کمپنی کے امریکی مالکوں نے سعودی عرب چھوڑنے کے بعد شیورون، ٹیکسا کو اور ایگزون موبیل جیسی تیل کی کمپنیاں بنائیں۔

آرامکو پر کنٹرول اور شاہ فیصل

23 ستمبر 1932 کو سعودی عرب قیام میں آیا تھا اور شاہ عبدالعزیز اس کے پہلے بادشاہ بنے۔ تیل کی دریافت کے وقت عبدالعزیز ہی سعودی عرب کے فرمانروا تھے۔ 1953 میں ان کے انتقال کے بعد شاہ سعود بادشاہ بنے۔ 1964 میں ان کے بھائی فیصل نے انھیں معزول کیا اور اقتدار کی گدی سنبھال لی۔ شاہ فیصل کے دور میں ہی 1972 میں پہلی مرتبہ سعودی عرب نے آرامکو کا 20 فیصد کنٹرول حاصل کر لیا۔ 1973 میں شاہ فیصل کی قیادت میں سعودی عرب نے ان مغربی ممالک کو تیل سپلائی کرنے کا بائیکاٹ کیا جنھوں نے مصر اور شام کے خلاف جنگ میں اسرائیل کی حمایت کی تھی۔ سعودی عرب کا ایسا کرنا تھا کہ تیل کی قیمتوں میں یکا یک چار گنا زیادہ اضافہ ہو گیا۔

چند دلچسپ حقائق

پیٹرولیم لاطینی زبان میں دو لفظوں پیٹرو اور اولیم کا مرکب ہے۔ پیٹرو کا مطلب ہے پتھر اور اولیم کا مطلب ہے تیل۔ جدید دور میں سب سے پہلے تیل امریکہ میں 1859 میں نکالا گیا۔ کرنل ایڈورڈ ڈریک نے امریکہ کی ریاست پینسلونیا میں 27 اگست 1859 کو تیل کے ذخائر دریافت کیے جو صرف 12 میٹر گہرائی پر تھے۔ 1890 میں تیل کی پیداوار کی وجہ سے گاڑیوں کو وسیع پیمانے پر بنانا شروع کر دیا گیا۔

25 مارچ 1975 کو شاہ فیصل کے سوتیلے بھائی کے بیٹے فیصل بن مساعد نے ایک مجلس میں سب کے سامنے شاہ فیصل کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ اس وقت اپنے بھتیجے سے گلے ملنے والے ہی تھے۔ فیصل بن مساعد شاہ فیصل کے قتل سے پہلے امریکہ میں رہا کرتے تھے اور کچھ ہی عرصہ پہلے وہاں سے واپس آئے تھے۔ فیصل بن مساعد کا اسی سال 18 جون کو سر قلم کر دیا گیا۔ شاہ فیصل کے بعد ان کے بھائی خالد سعودی عرب کے بادشاہ بنے۔

سعودی عرب کے پیٹرولیم کے ذخائر: کیا سچ کیا جھوٹ

اس وقت سعودی عرب کے پاس دنیا کے 18 فیصد پیٹرولیم ذخائر ہیں اور پیٹرولیم برآمد کرنے والے ممالک میں سرِ فہرست ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی ہے کہ کیا یہ موجود ذخائر کے حوالے سے اعداد و شمار بالکل درست ہیں۔ گذشتہ پانچ دہائیوں سے اس سوال کا جواب تیل کے ذخائر کے ماہرین کے لیے ایک راز ہے۔ تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک کے 2015 کے اندازوں کے مطابق سعودی عرب کے پاس 267 ارب بیرل تیل کے ذخائر موجود ہیں اور اگر یہ اعداد و شمار درست ہیں تو سعودی عرب کا تیل آئندہ 70 سالوں میں ختم ہوگا۔ اس حساب کے لیے اوسط روزانہ 12 لاکھ بیرل کے استعمال کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ تاہم سعودی سرکاری اعداد و شمار کے بارے میں شکوک موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 1987 میں سعودی عرب نے اپنے ذخائر کی تعداد کے بارے میں کہا تھا کہ وہ 170 ارب بیرل ہیں۔ تاہم 1989 میں انھوں نے اس تخمینے کی تعداد بڑھا کر 260 ارب بیرل کر دی تھی۔ 2016 کے سٹیٹسٹیکل ریوو آف ورلڈ انرجی کے مطابق سعودی عرب اب تک 94 ارب بیرل تیل فروخت کر چکا ہے۔ تاہم ان کے سرکاری ذرائع کے مطابق ان کے پاس اب بھی 260 سے 265 ارب بیرل تیل موجود ہیں۔ اگر حکومتی اطلاعات درست ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو سعودی عرب نے تیل کے نئے ذخائر دریافت کیے ہیں یا پھر انھوں نے موجودہ ذخائر کا دوبارہ جائزہ لے کر انھیں تبدیل کر دیا ہے۔ ذخائر میں اضافے کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ جن ٹھکانوں سے تیل برآمد ہو رہا ہے وہیں اور تیل نکل آیا ہے یا وہ کنویں پھر سے بھر گئے ہیں۔ سعودی عرب میں 1936 سے 1970 کے درمیان تیل کے بے شمار ذخائر دریافت ہوئے۔ اس کے بعد قدرے نئی دریافتیں نہیں ہوئیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ جہاں جہاں تیل کی پیداوار ہو رہی ہے اس کی تفصیلات یا ذخائر کے بارے میں حکومت ہر بات خفیہ رکھتی ہے اور اس کی تفصیل کچھ ہی لوگوں کو معلوم ہوتی ہے۔ ایسے میں کسی بھی بات کی تصدیق کرنا مشکل ہے۔ ماہرین بھی یہ بات یقین سے نہیں بتا سکتے کہ سعودی عرب میں تیل کی پیداوار کب کم ہونی شروع ہوگی۔

تیل کے ذخائر کا تخمینہ لگانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس بات کا اندازہ لگایا جائے کہ پیداوار شروع ہونے سے پہلے کتنے ذخائر موجود تھے۔ اس اندازے کو او او آئی پی کہا جاتا ہے۔ 1970 کی دہائی میں اس بات پر اتفاق رائے موجود تھا کہ سعودی عرب میں 530 ارب بیرل او او آئی پی موجود تھے۔ سعودی او او آئی پی کے بارے میں معلومات سعودی عرب اور امریکہ کی مشترکہ آئل کمپنی آرامکو کے لیے امریکی سینیٹ کی کمیٹی برائے عالمی معاشی پالیسی نے دی تھیں۔ امریکہ کی کمپنی آرامکو نے 1970 کی دہائی کے آخری سالوں میں سعودی عرب کے تیل کے مستند ذخائر 110 ارب بیرل بتائے تھے اس کے ساتھ ہی مستقبل اور ممکنہ ذخائر کو بالترتیب 178 ارب بیرل اور 248 ارب بیرل بتایا تھا۔

سعودی آرامکو کتنا پیسہ بناتی ہے؟

اخبار گلف نیوز میں چھپنے والی ایک رپورٹ کے مطابق سال 2019 کے پہلے نصف میں آرامکو نے 46.9 ارب ڈالر کا منافع کمایا ہے جو کہ گذشتہ سال سے 12 فیصد کم ہے۔ سعودی آرامکو کی اقتصادی رپورٹ کے مطابق کمپنی پبلک میں مزید شیئرز بیچنا چاہتی ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان نے پہلے ہی اعلان کر رکھا ہے کہ وہ آرامکو کے 5 فیصد شیئر لسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ آرامکو کے سی ای او امین ناصر نے بھی اس بارے میں کہا ہے کہ وہ جلد ہی ریاض کی سٹاک ایکسچینج میں کمپنی کے شیئرز لسٹ کریں گے۔

مبصرین کے مطابق آرامکو کی لسٹنگ کی بنیادی وجہ ولی عہد محمد بن سلمان کا وہ منصوبہ ہے جس کے تحت سعودی عرب کی معیشت کا انحصار تیل پر کم کر کے اسے وسیع بنیادوں پر پھیلایا جائے گا۔ اسے 2030 وژن کہا جا رہا ہے اور سعودی عرب میں اس پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ سعودی عرب اپنے قیام سے ہی تیل کی معیشت پر انحصار کرتا رہا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا 20 لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر محیط یہ تین کروڑ تیس لاکھ کی آبادی والا ملک جس میں سے 70 لاکھ صرف دارالحکومت ریاض میں رہتے ہیں اپنی معیشت کو تیل کے بغیر مضبوط بنا پائے گا اور کیا سعودی عرب کے عوام اپنا رہن سہن ان لوگوں کی طرح کر پائیں گے جن کا تعلق تیل پر انحصار کے بغیر معیشتوں والے ممالک سے ہے۔ لیکن ان سب کے لیے خطے میں امن و استحکام بہت ضروری ہے اور موجودہ حالات میں یہ مشکل دکھائی دیتا ہے۔ (بشکریہ بی بی سی)

وادیٔ کشمیر

تحریر: ڈاکٹر وقار احمد رضوی

بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ بتاتا ہے لیکن تاریخ کے باب کا وہ موڑ جہاں ادراک کی سرحدیں ذہنی افلاس کی خاکنائے سے اپنا رشتہ جوڑتی ہیں، شاید وہیں زندگی کا کفن سلا کرتا ہے۔ آکاش کی وسعتوں نے جانے کتنی تہذیبوں کو تاریخ کے ایسے ہی خونیں موڑ کی نذر ہوتے دیکھا ہے۔ ظلم کے دیوتا نے منصور سے نعرہ انا الحق اور فرہاد سے تیشہ کو بکنی کو چھینا تھا۔ لیکن آج خود ساختہ تہذیب کا دیوتا۔ پھولوں سے نکہت ونم، کہکشاں سے رنگ و نور، ساز سے نغمہ، نغمہ سے درد، اور درد سے سوز کو جدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ وادی کشمیر جس کی رگوں میں اسلام کا خمیر رقصاں ہے۔ جس کے معبد کہن کو توحید نے آبرو بخشی۔ امرناتھ اور کیلاش کی چوٹیوں کی جس زمین کو مسلمانوں نے پاک وتقدس بخشا۔ جہاں نہ افرنگی کا مکروفن تھا اور نہ شاطروں کی چالبازیاں۔ افسوس کہ اب وہ زمین ہندو شاطروں کی سازشوں کا شکار ہوا چاہتی ہے۔

سروسمن اور پھولوں کے اس دیس میں چراغ لالہ نے کوہ دمن کو اس لئے روشن کیا تھا کہ اس کی روشنی سے نور ایمان کا ایک نیا سنگم بنے گا۔ آبشاروں نے نغمہ ریزی اس لئے سیکھی تھی کہ وہ اپنے میٹھے نغموں سے کفر کے پردے اٹھا کر، توحید کا ایک محل بنائیں گی۔ زعفران و بنفشہ کے کھیت اس لئے مسکرائے تھے کہ شاید ان کی مسکراہٹ سے مسلک تہذیب کا ایک جہاں آباد ہو سکے گا۔ لیکن دولت وسرمایہ کے علمبرداروں سے یہ نہ دیکھا گیا کہ مسلمان ایک مرکز پر مل سکیں۔ اور اب جب موت کا خونخوار درندہ انسانی خون کا پیاسا ہے۔ ایٹم کی دنیا نے پرچم توحید بلند کرنے والی قوم کو اجاڑنے کی ٹھانی ہے۔ اور تاریخ ایک بار پھر کشمیر کی وادیوں میں ہیروشیما اور ناگاساکی، کی داستانیں دہرانا چاہتی ہے۔ کشمیر ہمیشہ سے مسلمانوں کا حصہ رہا ہے۔ کشمیر کا جغرافیائی اور تاریخی الحاق ہمیشہ سے سرزمین پاکستان سے رہا ہے۔ پاکستان کے تمام دریا کشمیر سے نکلتے ہیں۔ یہ ایک جغرافیائی حقیقت ہے کہ پٹھان کوٹ اور جموں کی قدرتی سرحدوں کا فاصلہ کم نہیں تو اس سے زیادہ بھی نہیں جو بارہ مولہ اور راولپنڈی کے درمیان قرار پاتا ہے۔ شاہان مغلیہ سے پہل اور خود ان کے عہد میں کشمیر کا مسلمانوں سے قدرتی رشتہ، علاقائی، قانونی، تہذیبی اور رسمی حیثیت سے اور مضبوط ہو گیا تھا جو اب تک چلا آرہا ہے۔ مسلمانوں کا اور کشمیر کا تعلق محض قانونی اور علاقائی ہی نہیں بلکہ روحانی اور تاریخی بھی رہا ہے۔ اگر آج ہم کشمیر کو مسلمانوں سے الگ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں تاریخ کے ان صفحوں کو بھی بدلنا ہوگا، جن میں مسلمانوں اور کشمیر کے گیت گائے گئے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ کشمیر کی مسلمانوں سے علیحدگی اگر واقعی کوئی دلچسپ حقیقت ہے تو میں کہوں گا کہ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں ہواؤں اور دریاؤں کے رخ کو بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ پامیر اور قراقرم کے کوہساروں کو بھی ہمالیہ کی چٹانوں سے الگ کرنا ہوگا۔ چاند کی چاندنی، سورج کی کرنوں اور ستاروں کی روشنی کو بھی بدلنا ہوگا۔ ستارۂ سحری نے آج تک کوئی صبح ایسی نہیں دیکھی جس میں نسیم زعفران بار، کیسر کے دیس سے مسلمانوں کے لئے پیار ومحبت کا سندیسہ نہ لائی ہو۔ شام کے سورج کی ڈھلتی ہوئی سنہری کرنوں نے آج تک کوئی شام ایسی نہیں دیکھی، جس نے لالہ کوہسار کے شبستانوں میں نغمہ توحید کی یاد تازہ نہ کی ہو۔ نسیم سحری آج بھی آتی ہے اور اپنے ساتھ توحید کا پیام لاتی ہے۔ لالہ کوہسار آج بھی اپنی محفل سجاتا ہے۔ تو پھر یہ کیا ہے کہ زندگی سے زندگی کا ساز چھینا جا رہا ہے۔ دراصل کشمیر اور مسلمانوں کا تعلق روح اور جسم کا تعلق ہے۔ اور اگر واقعی یہ درست ہے کہ ساز کے پردوں سے نغمہ ولے کو الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ جسم کو روح سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تو پھر یہ بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ نسیم سحری کو سحر سے، لالہ کو ہسار کو کوہسار سے اور کشمیر کو مسلمانوں سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ آگ کو پانی سے الگ رکھتے ہوئے تو دیکھا ہے۔ اور سنا ہے لیکن پانی سے چمک، غنچے سے تازگی اور سیماب سے تڑپ کو جدا کرتے ہوئے نہ سنا ہے اور نہ ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔

کشمیر اور مسلمانوں کا سیاسی اور علاقائی رشتہ بہت پرانا ہے۔ مسلمان اور کشمیر ہمیشہ سے سماجی اور مجلسی زندگی میں ایک دوسرے کے برابر شریک رہے ہیں۔ وادی گل برگ، پہلگام اور سون مرگ کے بتاں لالائی، نگاراں خوبرو اور طائراں خوش الحان نے قلعہ معلیٰ سے زبان کی نغمگی سیکھی ہے۔ اور مسلمانوں کی ثقافتی، مذہبی اور فنی مرکزیت سے کشمیر کی جھیلوں، چشموں اور مرغزاروں نے زیست کا مزا پایا ہے۔ حسن کی کائنات یہیں سے سنوری۔

اگر فردوس برروئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اکبر کا خروی جاہ وجلال، جہاں گیر و نور جہاں کی محبت اور شاہ جہاں کا احساس جمال، آج بھی نشاط وشالامار باغ اور سرور شمشاد کی گھنی چھاؤں میں آرام کر رہا ہے۔ نسیم باغ کے گھنے سایہ دار چنار کے درخت مسلمانوں کے ذوق جمال اور ان کی تہذیب کو آج بھی یاد کیا کرتے ہیں۔ کشمیر کی شال بافی اور پیپر ماشی کی صنعتوں کو مسلمانوں ہی کی تائید سے فروغ ہوا۔ اس لحاظ سے مسلمانوں سے کشمیر کا اقتصادی رشتہ بھی بہت گہرا اور متوازن ہے۔ اقبال نے شاید اسی زمین کو دیکھ کر کہا تھا۔

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

لیکن وہ زمین جہاں سے نغمہ توحید بلند ہوتا ہے۔ آج اس کی جبیں خود عرق آلود ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس نے کوئی جرم وقصور کیا ہے بلکہ اس لئے کہ آج اس کی زمین دشت ویراں بنی ہوئی ہے۔ چشموں اور آبشاروں کی گود میں حسن یہاں اس لئے بے نقاب ہوا تھا کہ شاید پہنچے فلک کی رفعتوں میں گم ہو کر سراغ زندگی پا جائے۔ لیلیٰ شب نے یہاں گیسو و رخسار کو غازہ وعطر مشک بو سے اس لئے سنوارا تھا کہ شاید اس کا نالہ بے باک بیداری کا پیغام سنائے گا۔ آنکھوں کو حرارت ایمانی سے روشن کرے گا۔ اور دلوں کو گرمی حرارے گرما دے گا۔ یعنی اس میں حریت احرار کا صور پھونک دے گا۔ تا کہ وہ ہندو قوم کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔ لیکن فطرت کے سب قانون آج بے اثر ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ مرغ چمن کا ساز توحید، بے آواز ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم عقل وخرد کے نام نہاد پاسبانوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ کشمیر ابتدا سے مسلمانوں کا جز رہا ہے۔ کشمیر کا سیاسی، ملکی، ثقافتی رجحان ہمیشہ مسلمانوں سے وابستہ رہا ہے۔ اس سبب سے نہیں کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وادی کشمیر کے پہاڑوں اور جھیلوں میں اسلامی تہذیب کا عکس ہے۔ اور وہاں کی فضاؤں میں تاج محل، اقبال اور توحید کے ترانوں کی گونج پائی جاتی ہے۔ کشمیر کا مسئلہ صرف چالیس لاکھ انسانوں کی زندگی کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہاں کے مسلمانوں کے مستقبل کا بھی سوال ہے۔ کشمیر کی وادیوں میں جہلم کی موجیں آج بھی ایک بار پھر آواز اذان دے رہی ہیں۔ ہمیں اس آواز پر لبیک کہنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہوا اور سامراجی طاقتوں نے کشمیر کو چھیننے کی کوشش کی تو پھر جہلم کے کنارے خون کی ندیاں بہیں گی۔ پھولوں کا دیس تباہ ہو جائے گا۔ جھیلوں کی دنیا سنسان ہو جائے گی۔ حسن کی کائنات لٹ جائے گی۔ اور انسانیت یتیم ہو جائے گی۔ دراصل کشمیر میں جواہر لال نہرو کی پالیسی چل رہی ہے۔ جواہر لال، کشمیری پنڈت تھے۔ اس لئے ان کی یہ آرزو تھی کہ کشمیر بھارت سے نہ چھن جائے کیونکہ وہ ان کے آباؤ اجداد کا وطن ہے اسی لئے انہوں نے اپنے دوست شیخ عبداللہ کو جیل میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ شیخ عبداللہ کشمیر کو بھارت سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ نہرو خاندان کی یہ پالیسی اب تک چل رہی ہے۔ ورنہ کشمیر کو آزادی ملنے میں اور کوئی رکاوٹ نہیں۔

اگر یہ بات ہے تو علامہ اقبال بھی کشمیری برہمن تھے۔ اقبال نے خود کہا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ از آشنائے روم و تبریز است

لیکن وہ اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور رہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اسلام کا پرچم سر بلند کیا۔ مجھے امید ہے کشمیر آزاد ہوگا۔ رات کی تاریکی چھٹ جائے گی۔ ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔ اور کشمیر میں توحید کا نعرہ بلند ہوگا۔ حکومت جادوگری کا نام ہے۔ جس پر حکومت کی جاتی ہے۔ اگر وہ جاگ جائیں تو پھر سلطنت باقی نہیں رہتی۔ جب کوئی اسرائیل پیدا ہوتا ہے تو اس کی سرکوبی کے لئے موسیٰ پیدا ہوتا ہے۔ جمہوریت کے لباس میں ظلم وجور کا نظام نہیں چل سکتا۔ بھارت کا پالیمانی نظام، جنگ زرگری ہے۔ چشم فلک، قوموں کے عروج وزوال کو دیکھتی آئی ہے۔ کوئی چیز ایک پہلو پر قائم نہیں رہتی۔ دنیا کا رواج یہ ہے کہ وہ بدلتی رہتی ہے۔ کبھی عروج ہے۔ کبھی زوال۔ زندگی تغیر پذیر ہے۔ وہ نئے روپ دھارتی ہے۔ ایک قوم مرتی ہے۔ دوسری قوم ابھرتی ہے۔ یہی زمانے کا دستور ہے۔ اس لئے کشمیر ضرور آزاد ہوگا۔ ایک زمانہ تھا جب بابل ونینوا وعراق کی تہذیب کا بڑا نام تھا۔ وہ ایسی زوال پذیری ہوئی کہ اب اس کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ ایران کے تخت شاہی کو بھی موت نے نگل لیا۔ اور یونان وروم بھی برباد ہو گئے۔ کشمیر میں آسمان صبح سے آزادی کا نیا سورج ضرور طلوع ہوگا۔ اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق استصواب رائے عامہ کرایا جائے۔ بھارت کو کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کرنا چاہئے۔ ایک لاکھ کشمیریوں کا خون ناحق رنگ لائے گا۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں

شعبہ انٹرنیشنل

فرانس میں لاہور کی سکھ شہزادی کیوں مشہور ہے؟

تحریر: سجاد اظہر

لاہور کی شہزادی کی کہانی جس نے فرانسیسیوں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی بھی شخص کو تب تک ارب پتی تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک اس کی کشتی فرانس کے شہر سینٹ ٹروپاز (جسے فرانسیسی زبان میں ساں تھوپا کہتے ہیں) پر لنگر انداز نہیں ہوتی۔ اس شہر میں کوئی بھی گھر ایک ارب روپے سے کم کا نہیں اس لیے یہاں کا ہر شخص ہی ارب پتی ہے۔ لیکن یہاں کا پہلا ارب پتی ایک فرانسیسی جنرل الارڈ تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی 'فوجِ خاص' کا جنرل تھا۔ 20 کمروں اور 20 سویٹ پر مشتمل ان کا بنایا ہوا محل، جسے انہوں نے اپنی ہندوستانی بیوی کے نام پر 'پان دائے محل' کا نام دیا تھا، اب اس شہر کا فائیو سٹار ہوٹل ہے، جہاں ہر ارب پتی ایک رات ضرور گزارنے کی تمنا رکھتا ہے تاکہ وہ فرانس اور پنجاب کے درمیان پروان چڑھنے والی محبت کی اس لازوال داستان کا لمس محسوس کر سکے۔

اس کی دیواروں پر اب بھی وہ پینٹنگز موجود ہیں جو جنرل الارڈ کے انارکلی والے گھر کی ہیں۔ جنرل الارڈ اور پان دائے کی کہانی کیا ہے؟ وہ پنجاب پہنچ کر رنجیت سنگھ کی فوج میں کیسے ملازم ہوئے؟ یہ کہانی بڑی دلچسپ ہے جس میں رومان بھی ہے، ہیجان بھی ہے اور ہجرت کا پورا جہان بھی ہے۔ جنرل الارڈ سینٹ ٹروپاز میں 1785 میں پیدا ہوئے، جو تب ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ 1803 میں جب وہ 18 سال کے ہوئے تو انہوں نے نپولین کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی جہاں ان کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے نپولین نے انہیں خاص اعزاز سے نوازا۔ جب 1815 میں واٹرلو کی جنگ میں نپولین کو شکست ہوئی اور انہیں قید کر لیا گیا تو نپولین کے قریبی رفقا کو بھی نظر بند کر دیا گیا جن میں الارڈ بھی شامل تھے کیوں کہ وہ نپولین کے نظریاتی ساتھی تھے۔ تین سال بعد جب انہیں رہائی ملی تو فرانس میں نامساعد حالات کی وجہ سے وہ اٹلی اپنے ماموں کے پاس چلے گئے، جنہوں نے انہیں نوکری کے لیے ایران کے ولی عہد عباس مرزا کے پاس حلب بھجوا دیا۔ الارڈ کچھ عرصہ ولی عہد کے خصوصی دستے میں رہے مگر چونکہ وہ برطانیہ کی نظروں میں تھے اس لیے عباس مرزا نے برطانیہ کی مخالفت کے خطرے کے پیش نظر الارڈ سے معذرت کر لی، جس کے بعد انہوں نے کابل کا رخ کیا جہاں نپولین کا ایک اور جنرل وینچورا بھی موجود تھا۔ الارڈ اور وینچورا نے کابل میں رہنے کی بجائے لاہور جانا مناسب سمجھا کیونکہ اینگلو افغان جنگ کی وجہ سے کابل میں بھی خطرہ ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

ایران میں رہ کر الارڈ نے فارسی سیکھ لی تھی اور جب مارچ 1822 میں وہ جنرل وینچورا کے ہمراہ لاہور آئے تو دونوں نے رنجیت سنگھ کے وزیر خارجہ اور مشیر خاص فقیر عزیز الدین کی معرفت دربار تک رسائی حاصل کی۔ مہاراجہ اس وقت اپنی سرحدوں پر انگریز فوج کا خطرہ محسوس کر رہے تھے، اس لیے انہوں نے پنجابی فوج کو یورپی خطوط پر استوار کرنے کے لیے انہیں نعمت خداوندی سمجھا۔ دوسری جانب انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں یہ جاسوس نہ ہوں اس لیے انہوں نے کوئی فیصلہ نہ کیا لیکن حکم دیا کہ انہیں لاہور سے نکلنے نہ دیا جائے۔ تین مہینے ان کا مشاہدہ کرنے اور کافی سوچ بچار کے بعد رنجیت سنگھ نے ان کو ملازمت پر رکھ لیا دونوں کی تنخواہ 2500 روپیہ ماہانہ رکھی گئی۔ جنرل وینچورا کو پیدل فوج اور جنرل الارڈ کو رسالہ کا جرنیل بنایا گیا۔ فوج میں شمولیت پر رنجیت سنگھ تمام غیر ہندوستانی افراد سے حلف لیتے تھے کہ وہ یورپی طاقت کے حملے کی صورت میں پنجاب کے وفادار رہیں گے، دربار کی اجازت کے بغیر وہ کسی یورپی حکومت کے ساتھ خط و کتابت نہیں کریں گے اور انہیں داڑھی رکھنی ہوگی، وہ گائے کا گوشت نہیں کھائیں گے، تمباکو نوشی نہیں کریں گے اور اگر شادی کریں گے تو ہندوستانی عورت کے ساتھ کریں گے۔ جنرل الارڈ نے 40 ہزار پنجابی فوج کو تربیت دی اور اسے جدید خطوط پر استوار کیا۔ ان کی تربیت اتنی سخت جان تھی کہ کئی فوجی بھاگ جاتے تھے، انہوں نے کمانڈوز پر مشتمل ایک پلٹن خاص اور دوسری گورکھا پلٹن قائم کی، جن کی تعریف برطانوی جنرل ایڈورڈ نے بھی کی کہ یہ ایشیا کی سب سے بہترین فوج ہے۔ 1825 میں پشاور اور ڈیرہ جات میں اور پھر 1827 سے 1830 کے درمیان سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کے خلاف انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ جمرود پر افغان بادشاہ دوست محمد کے حملے میں خالصا فوج کے سربراہ ہری سنگھ نلوہ مارے گئے تو اس کے بعد جنرل الارڈ نے ہی پشاور کی حفاظت یقینی بنائی۔ وہ ہمالیہ سے ملتان تک انگریز فوج کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے رہے۔ وہ جب تک زندہ رہے انگریز فوج پنجاب میں داخل نہیں ہو سکی۔ انہوں نے پنجابی فوج کی وردی نپولین کی فوج کی طرز پر بنوائی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جنرل الارڈ پر اس حد تک اعتبار کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے کمانڈو دستے کی سالاری جنرل الارڈ کو دی جس کی تعداد چھ ہزار تھی۔ جنرل الارڈ مہاراجہ کے علاوہ کسی کو جواب دہ نہیں تھے۔ مہاراجہ اور جنرل الارڈ کی قربت اس وقت رشتہ داری میں بدل گئی جب مہاراجہ نے اپنی رشتہ دار اور چمبا کے راجہ مینگا رام کی 12

سالہ بیٹی بانو پانڈے سے جنرل الارڈ کی شادی کرادی۔ مارچ 1826 میں ہونے والی یہ شادی دراصل اس دور میں شاہی خاندانوں میں دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے والی ایک شاہی روایت کا تسلسل تھی۔ بانو پانڈے جسے فرانسیسی میں پان دائے کہتے ہیں، 1814 میں پیدا ہوئیں اور محض 12 سال کی عمر میں بیاہی گئیں۔ اگلے آٹھ سالوں میں ان سے جنرل الارڈ کے سات بچے ہوئے۔ پان دائے شہزادی تھیں۔ وہ پوری مشرقی تہذیبی روایت کے ساتھ جنرل الارڈ کے گھر آئیں تو مغرب کے اس جرنیل کے دل کو ایسی بھائیں کہ انہوں نے فارسی میں پان دائے کی محبت میں نظمیں تک لکھ ڈالیں۔ الارڈ کی پہلی شادی سے ایک بیٹی میری شارلٹ تھی، جو انہیں بہت عزیز تھیں، جسے انہوں نے اپنے پاس ہندوستان بلوالیا۔ میری شارلٹ فرانس میں ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی مگر دوسری طرف وہ باپ تھا جس کی اس نے آٹھ سال سے شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ کہتے ہیں کہ شارلٹ ہندوستان آنے سے پہلے ایک راہبہ سے ملی جس نے اسے بتایا کہ تمہیں محبت نہیں ملے گی، ہندوستان میں موت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہی ہوا وہ ہندوستان آئی مگر پانچ اپریل 1827 کو اچانک انتقال کر گئی۔ جنرل الارڈ کو ان کی اچانک موت کا ازحد صدمہ ہوا اور انہوں نے 48 کنال کے احاطے میں مغل شہزادیوں کی طرح اپنی بیٹی کی قبر پر شاندار مقبرہ بنوایا اور شاندار باغ لگوایا جسے لاہور میں آج بھی کڑی باغ کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ الارڈ اپنی بیٹی کی اچانک موت پر سخت صدمے کا شکار ہوئے اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ان کی نوجوان بیوی کو بھی ان کے ساتھ ستی کر دیا جائے گا، اس لیے انہوں نے 1834 میں اپنی بیوی بچوں کو فرانس منتقل کرنے کا پروگرام بنایا۔ جنرل الارڈ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے اجازت لی کہ وہ فرانس میں اپنے بچوں کی تربیت عیسائی کے طور پر کرنا چاہتے ہیں۔

مہاراجہ راضی نہیں تھے، انہیں خدشہ تھا کہ الارڈ واپس نہیں آئیں گے، تاہم الارڈ نے وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف واپس آئیں گے بلکہ فرانس سے جدید ہتھیار اور انگریزوں کے خلاف فرانسیسی بادشاہ کی مدد کا پروانہ بھی لائیں گے، جس پر مہاراجہ نے جانے کی اجازت دے دی۔ جنرل الارڈ جب فرانس گئے تو ان کی آؤ بھگت شاہی مہمان کے طور پر کی گئی۔ فرانس میں الارڈ اور پان دائے کی شادی کی رسومات مذہبی طریقے سے چرچ میں ادا کی گئیں۔ الارڈ نے فرانس میں پان دائے کے لیے ایک عالی شان محل بنوایا جس میں نہ صرف ہندوستانی طرز تعمیر کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا بلکہ اس میں ہندوستان سے لائے گئے فن مصوری کے شاہکار بھی آویزاں کیے گئے۔ اس دور میں یہ سینٹ ٹروپاز کا سب سے شاندار محل تھا۔ جنرل الارڈ نے دسمبر 1835 میں فرانس کو الوداع کہا اور پھر دوبارہ وہ اپنے خاندان کو دیکھ نہیں سکے۔ 1838 میں انہیں پشاور میں جنرل اوتیبل کی مدد کے لیے بھیجا گیا، جہاں 23 جنوری 1839 کو دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ مہاراجہ چونکہ خود بھی بیمار تھے اس لیے انہیں یہ افسوسناک خبر نہیں دی گئی۔ ان کی لاش لاہور میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ لائی گئی۔ پشاور سے لاہور تک ہر فوجی چھاؤنی میں انہیں گارڈ آف آنر دیا گیا۔ جب ان کی لاش لاہور پہنچی تو شاہدرہ سے انارکلی تک تمام راستے میں فوجی کھڑے تھے جنہوں نے فائرنگ کر کے اپنے بہادر جرنیل کو خراج تحسین پیش کیا۔ انہیں کڑی باغ میں وہیں دفن کیا گیا جہاں ان کی دو بیٹیاں دفن تھیں۔ ادھر فرانس میں پان دائے کو ایک ہندوستانی شہزادی اور جنرل الارڈ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے خصوصی رتبہ حاصل تھا اور وہاں کی اشرافیہ میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب انہیں جنرل الارڈ کے انتقال کی خبر ملی تو وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہ ہوئیں۔ وہ بہت کھوئی کھوئی رہنے لگیں۔ ذہنی سکون کے لیے وہ چرچ جانے لگی اور پھر عیسائیت قبول کر کے رومن کیتھولک فرقے میں داخل ہو گئیں۔

فرانس کے بادشاہ اور ملکہ نے انہیں ایک خصوصی تقریب میں اپنی بیٹی کا خطاب دیا، جس میں جنرل الارڈ کے دوست جنرل ونچورا بھی تشریف لائے۔ 25 جولائی 1845 کو پان دائے کی چھوٹی بیٹی فلس، جن کی عمر دس سال تھی، فوت ہو گئیں۔ اپنے خاوند اور بیٹی کی پے در پے موت کے صدموں کی وجہ سے پان دائے کا دل اب اس محل میں نہیں لگتا تھا، جس کے ایک ایک پتھر پر جنرل الارڈ کی یادیں نقش تھیں۔ وہ ساحل سمندر پر بنے ایک اور گھر میں منتقل ہو گئیں جہاں باقی عمر انہوں نے جنرل الارڈ کو یاد کر کے گزار دی۔ کہتے ہیں کہ وہ روزانہ شام کو ساحل سمندر پر بیٹھ جاتیں اور آتی جاتی لہروں سے سوال کرتیں کہ کسی نے جنرل الارڈ کا جہاز سمندر میں ہندوستان سے آتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب کوئی جواب نہ آتا تو سر شام آنسوؤں کی مالا لیے لوٹ جاتیں اور پھر ساری رات سمندر کی طرف کھلی ہوئی کھڑکیوں میں بیٹھے تارے گنتے گزار دیتیں۔ وہ چاہتیں تو ہندوستان لوٹ سکتی تھیں مگر الارڈ کی خواہش کے مطابق انہوں نے بچوں کی پرورش عیسائی طریقے سے کی۔ ان کے بچوں کی شادیاں فرانسیسی اشرافیہ کے خاندانوں میں ہوئیں۔ بالآخر 13 جنوری 1884 کو سینٹ ٹروپاز میں ہندوستان کی یہ بے چین روح پرواز کر گئی مگر ان کے مقبرے پر جانے والے محبت کا وہ کرب محسوس کرتے ہیں جو لاہور سے فرانس تک پھیلا ہوا تھا۔ فرانسیسی حکومت نے شہر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ، جنرل الارڈ اور پان دائے کے مجسمے نصب کیے ہیں۔ پان دائے ہوٹل میں نصب وہ تاریخی پینٹنگ بھی سیاحوں کا دل کھینچتی ہے جس میں انارکلی میں واقع گھر میں جنرل الارڈ اپنے خاندان کے ساتھ موجود ہیں۔ سینٹ ٹروپاز میں الارڈ خاندان کی اب پانچویں نسل رہتی ہے۔ ان کا لکڑپوتا ہنری پرووسٹ الارڈ شہر کا ڈپٹی میئر بھی رہ چکا ہے۔ وہ فرانسیسی میں لکھی گئی تین کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جس میں سے ایک کتاب جنرل الارڈ پر بھی ہے۔ محبت کی اس لازوال داستان نے لاہور میں جنم لیا مگر یہاں کسی کو نہیں معلوم کہ 'کڑی باغ' کی کیا کہانی ہے؟ مقبرہ انارکلی جہاں آج پنجاب کا سول سیکرٹیریٹ ہے، اسے فرانسیسی جنرل لارڈ اور ان کی بیوی پان دائے کے لیے بنایا گیا تھا۔ فرانس والے لاہور میں جنم لینے والی محبت کی اس داستان کو دنیا بھر کے ارب پتیوں کو بیچ رہے ہیں اور ہم یہ جانتے تک نہیں کہ اس داستان کا تعلق لاہور سے ہے۔

تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا بحران

تحریر: شکیل اختر

یہ سماجی برابری کی جنگ میں دلت برادری کی ایک اہم کامیابی ہے۔ دلت صدیوں کی تفریق، اہانت اور مظالم کے خلاف ایک طویل عرصے سے نبرد آزما ہیں۔ انھیں آج بھی سماجی نفرتوں اور تفریق کا سامنا ہے لیکن سیاسی اعتبار سے وہ پہلے کے مقابلے میں کافی طاقتور ہوئے ہیں۔ آزادی سے پہلے انھیں بھیم راؤ امبیڈکر جیسا مفکر اور رہنما ملا جس نے دلتوں کے چھینے ہوئے وقار اور سماجی مساوات کے لیے ایک غیر معمولی تحریک کی قیادت کی۔ اس تحریک کو کانشی رام جیسے رہنما نے دلتوں میں سیاسی بیداری کی لہر سے ایک نئی بلندی پر پہنچایا۔ آج ہندوستان کی پارلیمنٹ میں کسی بھی وقت ساڑھے پانچ سو ارکان میں سے تقریباً سو ارکان دلت اور قبائل برادریوں سے آتے ہیں۔ انڈیا کی بیشتر اسمبلیوں میں بھی دلتوں کے لیے سیٹیں مختص ہیں۔ تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں دلتوں کے لیے سیٹیں مختص ہونے سے وہ اب تعلیم اور روزگار میں بھی آگے آئے ہیں۔

ہندوستانی معاشرے میں دلتوں کی ایک نئی نسل ابھر رہی ہے۔ نوجوانوں کی یہ نئی نسل پر اعتماد، سیاسی طور پر بیدار اور قیادت کے لیے بے چین ہے۔ اٹھارہ فی صد آبادی کے ساتھ وہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ملک کی دوسری سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں۔ انڈیا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً 14 فیصد ہے۔ تعلیم، روزگار، صحت اور سیاسی نمائندگی کے اعتبار سے وہ اب ملک میں سب سے پیچھے ہیں۔ ان کی سماجی اقتصادی اور تعلیمی ہیئت ایک جیسی نہیں ہے۔ بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد مسلمانوں کی مشکلیں بڑھ گئی ہیں۔ انھیں صرف ہجوم کے ہاتھوں تشدد کا ہی خوف نہیں ہے، حکومت نے غیر قانونی مذبح خانوں کو بند کرنے کے نام پر اور مویشیوں کی خرید وفروخت کے نئے ضابطوں سے مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو ایک لمحے میں بے روزگار کر دیا ہے۔ سوشل میڈیا اور ٹی وی چینلوں پر قوم پرستی کی لہر جاری ہے۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز پیغامات پوسٹ اور تبصروں کا ایک منظم سلسلہ ہے۔ حکمراں بی جے پی ایک ہندو نواز پارٹی ہے اور ہندوتوا کے سیاسی اور مذہبی نظریے میں یقین رکھتی ہے۔ بہت سے تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ وہ ملک کو ایک ہندو راشٹر بنانے کے تصور پر عمل پیرا ہے جس میں مسلم اور مسیحی اقلیتوں کے لوگ دوسرے درجے کے شہری ہوں گے۔ مسلمانوں نے ابتدا سے ہی بی جے پی کی مخالفت کی ہے۔ اب جب کہ بی جے پی اپنے زور پر اقتدار میں ہے اس نے مسلمانوں کو پوری طرح مسترد ہی نہیں بلکہ محدود کر دیا ہے۔ اپوزیشن انتہائی کمزور اور پوری طرح منتشر ہے۔ قوم پرستی کے اس دور میں میڈیا حکومت نواز ہو چکا ہے۔ بی جے پی کا سیاسی اثر بڑھتا جا رہا ہے اور اپوزیشن جماعتیں کوئی نظریاتی یا سیاسی چیلنج بننے کے بجائے اپنے باقی ماندہ وجود کو بچانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بہت سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ انھیں تقسیم ہند کے بعد اب تک کے سب سے سنگین بحران کا سامنا ہے لیکن کئی تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کا نہیں ملک کے اعتدال پسندوں اور جمہوریت نواز اکثریت کا بحران ہے۔ برطانوی مبصر اور رکن پارلیمان میگھناد دیسائی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انڈیا کے 18 کروڑ مسلمانوں کو اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اپنی ایک علیحدہ سیاسی پارٹی بنانی چاہیے۔ مسلمان بھارتی جمہوریت میں ہمیشہ مین سٹریم سیاسی جماعتوں یا قومی دھارے سے وابستہ رہے ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کو ووٹ بینک کے طور پر استعمال کیا اور انھیں غربت اور پسماندگی میں دھکیلتی گئیں۔ ان دشوار مراحل میں بھی مسلمانوں کا رویہ ہمیشہ مثبت رہا۔ اس نے مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت کے تصور کو کبھی قبول نہیں کیا۔ بھارتی جمہوریت کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب ملک کی پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی سب سے نیچے آ گئی ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی والی ریاست اتر پردیش میں حکمراں جماعت کے ارکان اسمبلی میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ مسلمان بی جے پی کو ایک ہندوتوا وادی اور مسلم مخالف جماعت سمجھتے آئے ہیں اور مستقبل میں ان کی اس سوچ کو اور بھی تقویت حاصل ہوگی۔ وہ بی جے پی کو صرف اپنے لیے نہیں ملک کی جمہوریت کے لیے بھی خطرہ سمجھتے ہیں۔

ملک میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی جس طرح کی فضا بنی ہوئی اس ماحول میں ملک کے طول وعرض میں ہر جگہ مسلمانوں میں بے بسی، گھبراہٹ اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ ہر طرف بحث ومباحثے چھڑے ہوئے ہیں۔ ایک نوجوان دلت رہنما نے کچھ دنوں پہلے کہا تھا کہ مسلمانوں کو اوپر لانے کے لیے ایک امبیڈکر کی ضرورت ہے۔ شاید انھیں بے چینیوں سے کوئی امبیڈکر اور کانشی رام پیدا ہو جو انڈیا کی خطرے میں گھری ہوئی جمہوریت کو درپیش چیلنجز میں بھارتی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کر سکے۔

جب نواب منصور علی خان پٹودی کی برات شرمیلا ٹیگور کے گھر اتری

تحریر: عقیل عباس جعفری

وہ 27 دسمبر 1969 کا دن تھا جب انڈین کرکٹ ٹیم کے کپتان نواب منصور علی خان پٹودی کی برات فلمی اداکارہ شرمیلا ٹیگور کے گھر اتری۔

شمالی ہندوستان کی پٹودی ریاست کے اس آخری 'نواب' اور اپنے زمانے کی مشہور اداکارہ کے درمیان شادی پر منتج ہونے والا تعلق چار برس قبل اس وقت قائم ہوا تھا جب شرمیلا منصور پٹودی کی ٹیم کا میچ دیکھنے دلّی میں سٹیڈیم آئی تھیں۔ پانچ جنوری 1941ء کو بھوپال میں پیدا ہونے والے نواب منصور علی خان پٹودی کو کرکٹ کا کھیل وراثت میں ملا تھا۔ ان کے والد نواب محمد افتخار علی خان پٹودی ٹیسٹ کرکٹ میں انگلینڈ اور ہندوستان دونوں ممالک کی نمائندگی کر چکے تھے۔ منصور علی خان پٹودی کی گیارہویں سالگرہ کی کا دن تھا جب ان کے والد افتخار علی خان پٹودی پولو کھیلتے ہوئے وفات پا گئے یوں انتہائی کم عمری میں ریاست کی ذمہ داری منصور علی خان پٹودی کے کاندھوں پر آ گئی لیکن کرکٹ کے کھیل میں ان کی دلچسپی کم نہیں ہوئی۔ منصور علی خان پٹودی ایک جانب بہت اچھے بلے باز تھے اور دوسری جانب ایک پھرتیلے فیلڈر۔ وہ چیتے کی سی تیزی کے ساتھ گیند پر جھپٹتے تھے اور ان کی اسی پھرتی کی وجہ سے انہیں ٹائیگر کا خطاب دیا گیا تھا۔

16 سالہ کی عمر میں انہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ کی دنیا میں قدم رکھا۔ انہوں نے سسیکس اور اوکسفرڈ یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔ وہ پہلے انڈین تھے جو کسی انگلش کاؤنٹی کے کپتان بنائے گئے تھے۔ 1961ء میں محض 20 سال کی عمر میں ایک کار حادثے میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی مگر وہ اس محرومی کے باوجود ٹیسٹ کرکٹ بھی کھیلتے رہے اور محض 21 سال 70 دن کی عمر میں انھیں انڈیا کی کرکٹ ٹیم کی قیادت کا فریضہ بھی سونپ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ انڈین کرکٹ ٹیم کے مستقل کپتان بن گئے، وہ اپنے زمانے میں دنیا کے سب سے کم عمر کپتان تھے۔ 1965ء میں ان کی ملاقات اس وقت کی مشہور اداکارہ شرمیلا ٹیگور سے ہوئی۔ وہ دلی میں ایک ٹیسٹ میچ کھیل رہے اور شرمیلا وہ میچ دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ منصور علی خان پٹودی آکسفرڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے، ایک ریاست کے نواب تھے اور انڈین کرکٹ ٹیم کے کپتان۔ انھیں اردو پر کچھ زیادہ عبور بھی نہ تھا اور انھوں نے شرمیلا کی کچھ زیادہ فلمیں بھی نہ دیکھی تھیں۔ شرمیلا اس وقت اپنے کیریئر کے عروج پر تھیں اور اپنے بے باک فوٹو شوٹس کی وجہ سے مشہور تھیں۔ یہ تو علم نہیں کہ شرمیلا ٹیگور پر اس ملاقات کا کیا اثر ہوا مگر منصور علی خان پٹودی اس پہلی ملاقات میں ہی شرمیلا کے حسن کے اسیر ہو گئے۔

شرمیلا ٹیگور کا تعلق ایک معروف بنگالی گھرانے سے تھا تاہم ان کی پیدائش آٹھ دسمبر 1944ء کو حیدرآباد (دکن) میں ہوئی تھی۔ ان کے والد اپنے زمانے کے مشہور ہدایت کار ستیہ جیت رے کے دوست تھے۔ ستیہ جیت رے نے شرمیلا کو دیکھا تو انہوں نے ان کے والد سے کہا کہ وہ انہیں اپنی فلم 'اپور سنسار' یعنی اپو کی دنیا کے لئے کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے والد انکار نہ کر سکے اور یوں 12، 13 سال کی شرمیلا ٹیگور نے ستیہ جیت رے جیسے ہدایت کار کی فلم میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس کے بعد ستیہ جیت رے اور کئی دیگر بنگالی ہدایت کاروں نے انہیں اپنے فلموں میں موقع دیا۔ بنگال ہی کے ایک فلم ساز اور ہدایت کار شکتی سامنت اردو/ ہندی زبان میں ایک فلم بنا رہے تھے جس کا نام 'کشمیر کی کلی' تھا۔ انھوں نے اس فلم کے مرکزی کردار کے لیے شرمیلا ٹیگور کو پیشکش کی۔ شرمیلا نے یہ پیشکش قبول کر لی اور یوں ان کے لیے اس فلمی صنعت کے دروازے بھی کھل گئے اور جلد ہی وہ ایک مصروف اداکارہ بن گئیں۔

1960ء کی دہائی میں ان کی جو فلمیں نمائش پذیر ہوئیں ان میں وقت، این ایوننگ

ان پیرس، آمنے سامنے، ارادھنا اور سفر کے نام سرفہرست تھے۔ منصور علی خان پٹودی اور شرمیلا ٹیگور کی اگلی ملاقات پیرس میں ہوئی جہاں منصور علی خان پٹودی نے شرمیلا کو شادی کی تجویز پیش کی۔ شرمیلا یہ تجویز سن کر حیران رہ گئیں۔ منصور علی خان پٹودی نے شرمیلا کو ایک ریفریجریٹر کا تحفہ پیش کیا۔ گو کہ شرمیلا پر اس تحفے کا کچھ خاص اثر نہ ہوا مگر کیوپڈ اپنا تیر چلا چکا تھا۔ تین چار سال ملاقاتوں، ایک دوسرے کو سمجھنے اور اپنے گھر والوں کو راضی کرنے میں گزرا اور 27 دسمبر 1969ء کو دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ شرمیلا ٹیگور نے اس رشتے کے لیے اسلام قبول کیا اور ان کا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا۔ منصور علی خان پٹودی بدستور کرکٹ کھیلتے رہے اور شرمیلا فلموں میں کام کرتی رہیں۔ منصور علی خان پٹودی نے اپنے کیریئر میں 46 ٹیسٹ میچ کھیلے جن میں سے 40 میچ ان کی قیادت میں کھیلے گئے۔ 1970ء کی دہائی میں شرمیلا ٹیگور کی جو فلمیں منظر عام پر آئیں ان میں امر پریم، داغ، موسم، چپکے چپکے، نمکین اور دوریاں کے نام سرفہرست تھے۔ ان کا فلمی سفر 2010ء تک جاری رہا۔ شرمیلا ٹیگور نے اپنی بہترین اداکاری پر دو قومی فلم ایوارڈ اور ایک فلم فیئر ایوارڈ حاصل کئے۔ انھیں فلم فیئر لائف اچیومنٹ ایوارڈ کے لیے بھی منتخب کیا گیا اور بھارتی حکومت نے انہیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا۔ 2004 سے 2011 تک وہ بھارت کے سینٹرل بورڈ آف فلم سرٹیفکیشن (فلم سنسر بورڈ) کی چیئرپرسن رہیں اور 2005ء میں انھیں یونیسیف گڈ ول ایمبیسڈر کے منصب پر فائز کیا گیا۔ نواب منصور علی خان پٹودی 22 ستمبر 2011ء کو وفات پا گئے۔ ان کی شرمیلا ٹیگور سے شادی انڈین فلمی صنعت کی چند کامیاب ترین شادیوں میں شمار ہوتی ہے۔ ان کے تین بچے ہوئے جن میں سے سیف علی خان اور بیٹی سوہا خان بھارتی فلمی صنعت سے وابستہ ہیں جبکہ ان کی ایک اور بیٹی صبا علی خان جیولری ڈیزائنر ہیں۔ منصور علی خان پٹودی اور شرمیلا ٹیگور کی شادی کرکٹ اور فلمی دنیا کے ملاپ کی پہلی مثال نہیں تھی، ان سے پہلے پاکستانی ٹیسٹ کرکٹر وقار حسن فلمی اداکارہ جمیلہ رزاق کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ چکے تھے۔ ان سے بھی بہت پہلے نذر محمد اور نور جہاں کا معاشقہ اپنے وقت کے معروف معاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ منصور علی خان پٹودی اور شرمیلا ٹیگور کے بعد جو کرکٹرز اور اداکارائیں شادی کے بندھن میں منسلک ہوئے ان میں سرفراز نواز اور رانی، محسن حسن خان اور رینا رائے، محمد اظہر الدین اور سنگیتا بجلانی، ہربھجن سنگھ اور گیتا بسرا، یوراج سنگھ اور ہیزل کیچ، ظہیر خان اور ساگریکا اور ویرات کوہلی اور انوشکا شرما کے نام اہم ہیں۔

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیئے کی ڈاکو مینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکو مینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،..... ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

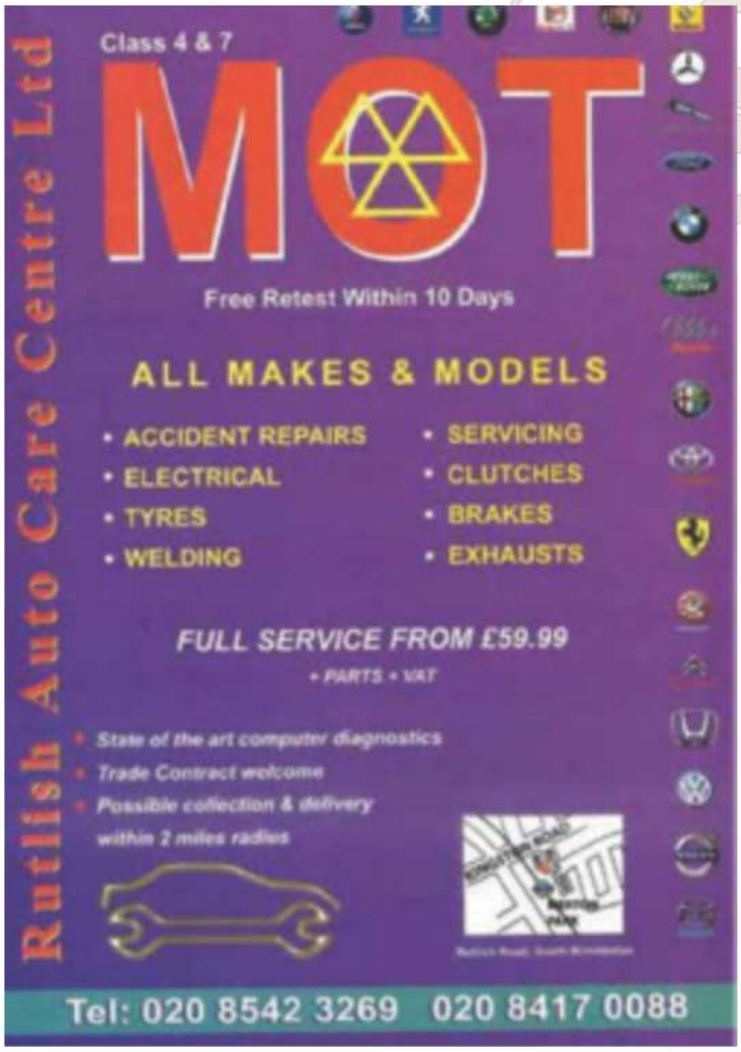

17ویں صدی کی خاتون جس نے دنیا کا سب سے پراسرار اور مہلک زہر بنایا

سنہ 1791 میں ولفینگ امیڈیوس موزارٹ بسترِ مرگ پر پڑے یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ ان کی بیماری دراصل زہر دیے جانے کا نتیجہ ہے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس زہر کے اجزا کیا ہیں۔ انھوں نے اس وقت کہا کہ 'کسی نے مجھے ایکوا طوفانا دیا اور میری موت کے عین وقت کا حساب بھی لگا لیا۔' ایکوا یا ایکوا طوفانا ایک افسانوی زہر تھا اور یہ جرائم کو مہارت اور انتہائی باریکی سے سرانجام دینے کے لیے بہترین سمجھا جاتا تھا۔ یہ بظاہر بے ذائقہ، بے رنگ اور بنا خوشبو کے تھا اس لیے اس کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس زہر کو دینے والا متاثرہ شخص پر اس کے اثرات کو کنٹرول کر سکتا تھا اور متاثرہ شخص کی موت کے وقت کو ایک ہفتہ، ایک ماہ یا ایک برس قبل تک جان سکتا تھا اور اس کے متاثرہ شخص کے جسم میں کوئی نشان نہ ملتے۔ اس پرسرار مائع، جس نے یورپ کو خوفزدہ کیے رکھا، کی تاریخ ایک صدی پرانی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس راز کا انکشاف ہونے سے قبل چھ سو مرد اپنی بیویوں کے ہاتھوں اس زہر کے اثرات سے مارے گئے تھے۔ یہ سب کیسے ہوا تھا یہ ایک تاریک لوک کہانی جیسا ہے۔ ایکوا طوفانا کی سب سے زہریلی قسم کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ 17ویں صدی کے دوران ایک اطالوی امیر خاتون گیولیا طوفانہ کی تخلیق تھی۔ وہ دیسی یا آرگینک کاسمیٹکس بنانے کے لیے جانی جاتی تھی، خصوصاً وہ ان خواتین کے لیے کاسمیٹک مصنوعات تیار کرتی تھی جنھیں چہرے پر نشانات اور چھائیوں سے زیادہ سنجیدہ مسائل کا سامنا تھا۔ ان کے ہم عصروں کے مطابق ایکوا طوفانہ کو 'سان نکولس ڈی باری کے مینا' کے طور پر چھپا کر بیچا جاتا تھا اور اسے ایک شفا بخش تیل سمجھا جاتا تھا۔

یہ اس وقت کے گھروں میں عام پایا جاتا تھا۔ 'چیمبرز جریدے' کی رپورٹ کے مطابق سنہ 1890 میں اس کے چند قطرے کسی بھی طاقتور ترین شخص کی زندگی ختم کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ کسی بھی خوشامدی غدار کی نگرانی میں اسے شراب، چائے یا کسی اور مشروب میں ملا کر دیا جاتا اور اس کے مہلک اثرات کا پتہ بھی نہ چلتا۔ اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کو دیتی تو اس کے اثرات کے باعث شوہر تھوڑا چڑچڑا ہو جاتا، کچھ کمزوری اور تھکاوٹ محسوس کرتا، صرف اتنی سے طبیعت ناساز ہوتی جس پر وہ بمشکل ہی ڈاکٹر سے معائنہ کرواتا۔ اس زہر کی دوسری خوراک کے بعد سے ہی کمزوری اور تھکاوٹ کی شکایات مزید بڑھ جاتی مگر ایسے میں وہ خوبصورت بیوی جو اپنے شوہر کی حالت پر انتہائی پریشانی اور بے چینی کا اظہار کرتی دکھائی دیتی اور اپنے خوبصورت ہاتھوں سے ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخے کے مطابق اپنے شوہر کا کھانا بھی تیار کرتی، پر شائد ہی کسی کو شبہ ہوتا۔

بس اسی طرح اس زہر کی تیسری خوراک ملتے ہی بڑے سے بڑا جنگجو بھی ڈھیر ہو جاتا تھا۔ 'ڈاکٹر بھی یہ دیکھ کر پریشانی اور شش و پنج کا شکار ہو جاتے کہ محض ایک معمولی سی بیماری پر ان کی دوا اثر نہیں کر رہی اور انھیں اس مرض کی وجہ بھی سمجھ نا آتی، وہ مزید ادویات دیتے یہاں تک کے آخر کار متاثرہ شخص کی موت ہو جاتی۔'

اتنے سارے مرد کیوں؟

اس داستان کے مطابق گیولیا طوفانہ نے یہ زہر سینکڑوں اطالوی خواتین کو دیا تھا جب تک کہ ان میں سے ایک خاتون نے اپنے شوہر کو زہریلا سوپ دیتے وقت گھبرا کر یہ بھانڈا نہیں پھوڑا تھا اور اس طرح اس نے وہ سب کچھ بتا دیا جو دیگر خواتین اب تک چھپانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ اگر آپ اس بات پر حیران ہیں کہ اس وقت کیوں اس قدر زیادہ تعداد میں خواتین یہ جرم کرنے پر آمادہ ہو گئی تھیں تو یاد رکھیں محبت کی شادی کرنا آج کے دور کے بات ہے۔ اس دور میں بااثر خواتین کی شادی بھی ان کی مرضی کے بنا طے کر دی جاتی تھی اور ان سے ان کے مستقبل کے شوہر کے متعلق راضی نامہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اس طرح اس وقت کے معاشرے میں خواتین کو ہمیشہ کم تر سمجھا جاتا تھا اور یہ بات حیران کن نہیں تھی کہ اگر ان میں سے کسی کا

شوہر غصیلا ہوتا اور اس پر تشدد کرتا تو یہ رشتہ ان خواتین کی موت پر ختم ہوتا یا ان کی زندگیاں خطرے میں ہوتی تھی۔

محبت کے لیے قتل کرنا

ماریہ آلڈوبرانڈینی روم کے ایک نہایت بااثر اور طاقتور قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی شادی تیرہ برس میں ان سے تیس برس بڑے شخص ڈیوک آف سیری فرانسیسکو سیسی کے ساتھ کر دی گئی۔ ڈیوک فرانسیسکو بھی بہت نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔(ان کے والد گلیلیو کے قریبی سائنسدان ساتھی تھے اور مستقبل کے پوپ الیون کے بھتیجے تھے۔)

ڈیوک آف سیری سنہ 1657 میں شادی کے نو برس بعد اچانک فوت ہو گئے اور ان کا شمار ان امیر ترین اور طاقتور ترین افراد میں ہونے لگا جو ایکوا طوفانہ زہر سکینڈل کے باعث ہلاک ہوئے تھے۔ الیسیند رواڈیمولو (1826-1891) کے بیان کے مطابق، جنھوں نے آرکیو دی سٹیٹو ڈی روما کے قدیم عدالتی ریکارڈوں کی بنیاد پر اپنی تحقیقات کے نتائج شائع کیے تھے، جیوانا ڈی گرینڈس، جو طوفانا کے لیے کام کرتے تھے، نے اعتراف کیا کہ الڈوبرانڈینی کو کسی اور سے پیار ہو گیا تھا اور اس کی وجہ سے وہ اپنے شوہر سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی جو پہلے ہی بیمار تھے۔ انھوں نے روم کے ایک مرکزی چرچ کے پادری فادر گیرالوڈی سنٹگانیس سے رابطہ کیا جو خواتین کو طوفانہ کا زہر مہیا کیا کرتے تھے۔ پادری نے انھیں ایکوا طوفانہ دیا اور کچھ دن بعد سیسی کی لاش تابوت میں پڑی تھی۔ تاہم وہ امید کے مطابق کامیابی حاصل نہیں کر سکیں، ان کے اپنے گھر والوں نے اس کے پریمی سینٹینیلی کے ساتھ سکینڈل زدہ اور غیر مساوی دوسری شادی سے بچنے کے لیے انھیں قید کر دیا۔ کچھ برس بعد جب زہر خورانی کی حقیقت سامنے آئی تو ان پر اپنے شوہر کی موت کا شبہ کیا گیا لیکن سکینڈل سے بچنے کے لئے ان پر کبھی بھی الزام عائد نہیں کیا گیا۔

یہ کہانی الجھی ہوئی ہے

اس کہانی کے ساتھ مسئلہ صرف ناکافی تفصیلات اور معلومات کا ہے۔ چند روایات کے مطابق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ گیولیا طوفانہ سنہ 1630 میں سسلی میں کام کرتی تھی۔ روم، نیپلز اور پالرمو کی باقی روایات میں کہانی کچھ ایسے ہی بیان کی گئی ہے۔ بعض جگہوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے اس زہر کو ایجاد کیا تھا۔ کچھ روایات کے مطابق انھیں یہ ان کی والدہ کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔ اس انتہائی پراثر محلول کی ترکیب کسی کو نہیں پتہ البتہ سب ذرائع اس کو آرسینک یعنی سنکھیا کے عنصر ملا محلول قرار دیتے ہیں۔

محقق ڈیش کا کہنا ہے کہ یہاں اس کی پراسراریت میں اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم اس متنازع سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ طوفانہ اپنے انجام کو کب اور کیسے پہنچی تھیں۔ ایک ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ سنہ 1651 میں طبعی موت مری تھیں جبکہ دوسرے ذرائع کے مطابق انھوں نے ایک کونونٹ میں پناہ لے لی تھی اور کئی برس وہاں بیتائے اور وہاں وہ اپنا زہر بناتی رہیں اور مذہبی رہنماؤں کے ذریعے اس کو پھیلاتی رہیں۔ چند دعوؤں کے مطابق انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا، پھر تشدد کا نشانہ بنا کر انھیں پھانسی دے دی گئی تھی۔ البتہ ان کی موت کے حوالے سے مختلف دعوے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ان کی موت 1659، 1709 یا 1730 میں ہوئی تھی۔ ایک تفصیلی روایت کے مطابق طوفانہ کو ان کی پناہ گاہ سے لے جا کر گلا دبا کر مار دیا گیا تھا اور اس کے بعد ان کی لاش کو کونونٹ کے علاقے میں ہی رات کے اندھیرے میں دفنا دیا گیا تھا۔

ولفینگ امیڈیوس موزارٹ کا کیا بنا؟

ولفینگ امیڈیوس موزارٹ کبھی بھی اپنے بستر مرگ سے نہیں اٹھ سکے۔ وہ پانچ دسمبر 1791 کو 35 برس کی عمر میں فوت ہو گئے۔ ان کی موت کے تقریباً 230 برس اور درجنوں تحقیقوں کے بعد آج ہم ان کی موت کی وجہ جانتے ہیں۔ لیکن اب بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی موت شاید زہر خورانی کے باعث ہوئی تھی لیکن آج بھی کوئی ایکوا طوفانہ کا ذکر نہیں کرتا۔

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

اسرائیل کے جاسوسی کے سافٹ وئیر سے پرینکا گاندھی کا فون بھی ہیک ہوا تھا

انڈیا میں حزب اختلاف کی اہم جماعت کانگریس پارٹی نے کہا ہے کہ گزشتہ انتخابات کے دوران پارٹی کی اہم لیڈر پرینکا گاندھی کا بھی واٹس ایپ ہیک ہوا تھا۔

کانگریس پارٹی کی جانب سے کی گئی ایک پریس کانفرنس میں دعوی کیا گیا ہے کہ جس وقت واٹس ایپ نے ہیک کیے جانے والے فونوں پر پیغامات بھیجے تھے اس وقت اتر پریش میں کانگریس پارٹی کی جنرل سیکریٹری پرینکا گاندھی کو بھی واٹس ایپ نے ایسا ہی پیغام بھیجا تھا۔ حال ہی میں فیس بک کی کمپنی واٹس ایپ نے بتایا تھا کہ اسرائیل میں بنے جاسوسی کرنے والے ایک سافٹ وئر سے دنیا بھر میں جن 1400 شخصیات کو نشانہ بنایا گیا تھا ان میں بھارتی صحافی، سیاست دان اور انسانی حقوق کے کارکنان بھی شامل ہیں۔ واٹس ایپ نے کہا کہ اس نے ان افراد کے پاس پیغامات بھیجے تھے جن کے فون 'پیگاسس' نام کے جاسوسی سافٹ وئیر سے ہیک ہونے کا خدشہ ہے۔ کانگریس پارٹی کے ترجمان رندیپ سرجیوالا نے بتایا کہ واٹس ایپ نے اس طرح کا ایک پیغام پرینکا گاندھی کو بھی بھیجا تھا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل مغربی بنگال کی وزیر اعلی ممتا بینرجی نے بھی دعوی کیا تھا کہ ان کا فون بھی ہیک کیا گیا تھا۔ واٹس ایپ کے مطابق پچھلے عام انتخابات کے دوران اپریل میں دو ہفتے تک انڈیا کی بعض سرکردہ شخصیات کے فون ہیک کیے گئے تھے۔ پریس کانفرنس میں بتایا گیا کہ پرینکا گاندھی نے اس وقت اس پیغام کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا اور بے معنی سمجھ کر ڈیلیٹ کر دیا۔ پریس کانفرنس کے دوران سرجیوالا نے حکومت پر براہ راست اس جاسوسی میں شامل ہونے کا الزام عائد کیا۔ انھوں نے کہا کہ مودی حکومت کو اس معاملے کی تفتیش کرانی چاہیے اور اس کے لیے ذمہ دار لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کرنی چاہیے۔

کانگریس پارٹی کا الزام ہے کہ سپریم کورٹ کے وکلا ہوں یا ریاستی حکومتیں سب کی جاسوسی کی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے پاس اس طرح کی اطلاعات بھی ہیں کہ پیگاسس سافٹ وئیر سے کون کون سے انٹرنٹ اور براڈ بینڈ نیٹ ورکس تباہ کیے گئے ہیں۔ بھارت میں واٹس ایپ کے 40 کروڑ صارفین ہیں لہذا بھارت اس کمپنی کے لیے سب سے بڑا بازار ہے۔ حال ہی میں اسرائیلی جاسوس سافٹ وئیر پیگاسس کے ذریعے بھارتی شخصیات کی جاسوسی کرنے کے معاملے میں انڈین حکومت نے واٹس ایپ سے وضاحت مانگی تھی۔ واٹس ایپ کی جانب سے اس بات کی تصدیق ہونے کے بعد کہ گزشتہ عام انتخابات کے دوران بھارت کی بعض اہم شخصیات کے فون ہیک کیے گئے تھے حزب اختلاف کی جماعتوں نے حکومت سے سوال پوچھنے شروع کر دیے ہیں کہ یہ سب حکومت کی مرضی کے بغیر کیسے ہوا؟

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا آپ کا قومی فرض ہے۔

سماجی سرگرمیاں

رپورٹ عابد شمعون چاند (سعودی عرب)

ریاض (عابد شمعون چاند، نمائندہ لاہور انٹرنیشنل) ینگ جرنلسٹ انٹرنیشنل سوسائٹی ریاض ریجن کے زیر اہتمام تقریب کا انعقاد کیا گیا تقریب کی صدارت ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل ریاض ریجن کے صدر کامران ملک کی زیر صدارت منعقد ہوئی تقریب کے مہمان خصوصی صدر ینگ جرنلسٹ انٹرنیشنل سوسائٹی مبشر انوار تھے تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت قرآن پاک کیا گیا تلاوت قرآن پاک معروف صحافی عابد شمعون چاند کو شرف حاصل ہوا استقبالیہ تقریب میں کامران ملک نے تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل کے مقاصد پر روشنی ڈالی ان کا مزید کہنا تھا ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل نئے آنے والے صحافی کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس میں وہ سینئر کی رہنمائی سے صحافت کے اصولوں پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں تقریب کے مہمان خصوصی صدر ینگ جرنلسٹ انٹرنیشنل سوسائٹی سعودی عرب مبشر انوار کا کہنا تھا میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے تمام صحافی بھائیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے میں ملک کامران کی پوری ٹیم ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل ریاض ریجن کو مبارکباد پیش کرتا ہوں آپ نے اتنی اچھی تقریب سجائی تقریب میں نائب صدر ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل سعودی عرب امتیاز احمد کا کہنا تھا آج سب صحافی بھائیوں کو ایک جگہ پہ اکٹھا دیکھ کے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے انشاء اللہ اب آپ کو پورے سعودی عرب میں ینگ جرنلسٹ سوسائٹی ایک ہی پلیٹ فارم پر نظر آئے گی تقریب میں شامل سینئر نائب صدر ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل ریاض ریجن وسیم خان کا کہنا تھا ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ مثبت صحافت کی جائے ہم انشاء اللہ تمام آئے ہوئے نئے صحافی بھائیوں کو ساتھ لے کر چلیں گے تقریب میں نائب صدر ریاض ریجن خرم خان کو نوٹیفکیشن بھی دیا گیا خرم خان نے سعودی عرب کے صدر مبشر انوار کا شکریہ ادا کیا ان کا کہنا تھا مجھے آپ نے جو ذمہ داری دی ہے میں ریاض ریجن کی پوری ٹیم کا شکریہ ادا کرتا ہوں تقریب میں شامل ڈائریکٹر یونائیٹڈ میڈیا فورم ڈاکٹر احمد ندیم بھٹی کا کہنا تھا آج بڑا اچھا لگ رہا ہے ریاض کے سارے سینئیر صحافی بھائیوں کو ایک جگہ پر دیکھ کے میں ملک کامران کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے تمام صحافی بھائیوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کیا ان کا مزید کہنا تھا آج کی تقریب اس لیے خوش آئند ہے کے سارے صحافی بھائیوں کے پاس ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعے وہ صحافت کو آگے تک لے جا سکتے ہیں تقریب میں خطاب کرتے ہوئے سینئر صحافی عابد شمعون چاند کا کہنا تھا ہماری سپورٹ اور نیک خواہشات ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل کے ساتھ ہیں ہم آپ کو اپنے پورے تعاون کی یقین دہانی کراتے ہیں جوائنٹ سیکرٹری ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل ریاض ریجن بابر ملک کا کہنا تھا ہم اپنی پوری کوشش کریں گے نئے آنے والے صحافی بھائیوں کو ساتھ لے کے چلیں تقریب میں شامل معروف سیاسی و سماجی شخصیت گل زیب کیانی کا کہنا تھا آج ایک بہترین تقریب منعقد کرنے پر ینگ جرنلسٹ سوسائٹی انٹرنیشنل ریاض ریجن کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں تقریب کے آخر میں بہترین کارکردگی دکھانے والے صحافیوں میں میڈل اور تحائف تقسیم کئے گئے تقریب میں شامل تمام صحافی بھائیوں نے کامران ملک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی۔

الوداعی شام۔۔شوکت جمال کے نام

ریاض (عابد شمعون چاند) سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں تخیل ادبی فورم کے زیر اہتمام نامور اردو زبان کے شگفتہ شاعر جناب شوکت جمال کے نام الوداعی شام کا انعقاد کیا گیا جس میں پاکستانی کمیونٹی نے بھرپور شرکت کی۔تقریب کا آغاز راشد منہاس نے تلاوتِ قرآن پاک سے کیا۔صدرات کے فرائض پروفیسر اقبال اعجاز بیگ اور نظامت کے فرائض راشد محمود نے ادا کئے۔تقریب کے مہمان خصوصی شوکت جمال

اور مہمان اعزاز صدف فریدی تھے۔تقریب کے آغاز میں راشد محمود نے شوکت جمال کی ادبی خدمات پر ایک مفصل مضمون پیش کیا۔صدف فریدی نے شوکت جمال کے نام ایک نظم نظر کی تخیل ادبی فورم کے پیٹرن ان چیف منصور محبوب نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے شوکت جمال کی زندگی کو ادبی اثاثہ قرار دیا تخیل ادبی فورم کے سینئیر ارکان صابر امانی اور محسن رضا سمر نے شوکت جمال کی ادبی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا تقریب کے صدر پروفیسر اعجاز بیگ نے شوکت جمال کے ساتھ ایک طویل رفاقت کا تفصیلی ذکر کیا اور ان کی شگفتہ شاعری کو بھرپور سراہا۔تقریب کے دوران ایک غیر رسمی مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں راشد منہاس، یاسر، منیب فیاض، کامران ملک، پیر اسد کمال، صابر امانی، منصور محبوب، سلیم کاوش، محسن رضا سمر، صدف فریدی، شوکت جمال اور پروفیسر اقبال اعجاز بیگ نے اپنا کلام سامعین کی نظر کیا اور خوب داد سمیٹی تقریب کے آخر میں سلیم کاوش نے اپنی کتاب متاعِ عشق شوکت جمال کو پیش کی۔جناب شوکت جمال نے اپنے اعزاز میں کامیاب تقریب کے انعقاد پر تخیل ادبی فورم کا شکریہ عطا کیا۔تقریب کے تمام شرکاء کو عشائیہ بھی دیا گیا۔

ریاض (عابد شمعون چاند) صدر پاکستان مسلم لیگ (ن) ریاض ریجن میاں محمد طارق جنید اور اراکین کور کمیٹی کی جانب سے مرکزی صدر سعودی عرب ملک منظور حسین اعوان اور ضلعی صدر مزاحمیہ مبارک علی بھٹی کی پوری ٹیم کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا تقریب میں کارکنوں سمیت عہدیداران نے بھی شرکت کی تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت قرآن مجید فرقان حمید سے کیا گیا جبکہ نظامت کے فرائض جنرل سیکرٹری ریاض ریجن راشد منہاس نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہوئے آنے والے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی صدر مسلم لیگ ن سعودی عرب ملک منظور حسین اعوان نے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کارکنان پارٹی کا قیمتی اثاثہ ہیں کارکنوں کی پہچان اور وقار انکی پارٹی اور پارٹی کی قیادت ہوتی ہے۔ ہماری پارٹی نا صرف ملک پاکستان کی ترقی بلکہ اس کی سرحدوں کی بھی محافظ ہے۔کارکنوں کے لیے میں ہر وقت حاضر ہوں۔

تقریب سے سرپرست مسلم لیگ ن سعودی عرب رانا محمد اشرف سمیت، چیئرمین ریاض ریجن ملک راشد پرویز اعوان، ملک اسلم کھوکھر، جنرل سیکرٹری ریاض ریجن راشد منہاس اور صدر مسلم لیگ سعودی عرب میاں طارق جنید نے بھی خطاب پارٹی کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے پر زور دیا تقریب میں چیئرمین، صدر کلچرل ونگ اور کوارڈینٹر ریاض ریجن کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا تقریب کے آخر میں کارکنوں سمیت کووڈ 19 میں اعلی خدمات سرانجام دینے والے صحافیوں کو اعزازی شیلڈوں سے نوازا گیا خوبصورت تقریب منعقد کرنے پر حاضرین نے پاکستان مسلم لیگ ن سعودی عرب کے تمام عہدیدارن کو خراج تحسین پیش کیا۔

دمام (عابد شمعون چاند) وطن عزیز میں توانائی کے بحران، اسباب اور امکانات کے عنوان سے پاکستان فورم نے ایک سمینار کا اہتمام کیا جس میں دنیا بھر سے ہم وطنوں کی ایک کثیر تعداد شریک ہوئی صدر محفل صدر پاکستان فورم یعقوب سیفی نے کہا کہ پاکستان فورم ہمیشہ سے ہی وطن عزیز کے ہر اہم مسئلے پر اپنا مثبت کردار ادا کرتا آرہا ہے اور آج توانائی کے جس شدید بحران کا ہمارے ملک کو سامنا اس کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی اور اس سے نجات کی جدوجہد میں سمندر پار پاکستانیوں کے کردار سے متعلق مکمل اور مستند معلومات و آگاہی کی غرض سے آج اس سمینار کا ہم نے اہتمام کیا ہے پاکستان ایمبیسی ریاض میں تعینات ویلفیئر اتاشی ملک محمد ابوبکر نے سفیر پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے خطاب میں پاکستان فورم کی اس کاوش کو سراہا اور اس سمینار میں دنیا بھر سے شریک ماہرین اور افراد کے جذبے کی تعریف کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ ہم سب مل کر اتحاد و اتفاق کو اپنی قوت بنا کر وطن عزیز کو توانائی کے بحران سمیت ہر قسم کی مشکلات سے ان شاء اللہ نکالنے میں ضرور کامیاب ہوں گے میزبان بشارت اللہ نے یونیورسٹی آف پٹرولیم اینڈ منرلز سعودی عرب میں تعینات پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف کا تفصیلی تعارف کروایا اور ان کو خطاب کی دعوت دی۔ڈاکٹر محمد آصف نے توانائی اور خصوصاً بجلی کی کمی، اس کے اسباب، اس کے منفی اثرات، اور ممکنہ حل سے متعلق اپنی پریزینٹیشن کے ذریعے شرکاء تک مستند و مفید معلومات احسن انداز میں پہنچائیں۔

جمہوریت ہی نہیں ہندوازم بھی سخت گیریت کی زد میں

تحریر: شکیل اختر

انڈیا کی ریاست کرناٹک میں گذشتہ بدھ لنگایت برادری کے ہزاروں لوگوں نے ایک اجتماع میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ لنگایت کو ہندو مذہب کی ایک ذات کے بجائے ایک علیحدہ مذہب تصور کیا جائے۔ کرناٹک کی چھ کروڑ کی آبادی میں لنگایتوں کی آبادی 17 فی صد ہے۔ مہاراشٹرا، تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے بعض علاقوں میں بھی کچھ لنگایت آباد ہیں۔

ریلی میں لنگایت برادری کے مذہبی رہنماؤں نے اس بات پر زور دیا کہ لنگایت ازم ایک علیحدہ مذہب ہے اور یہ کبھی بھی ہندو مذہب کی ایک ذات یا ذیلی ذات نہیں تھی۔ ریلی میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ لنگایت مسلک کو آئین میں ایک علیحدہ مذہب کے طور پر تسلیم کیا جائے کیونکہ وہ ایک علیحدہ مذہب کے طور پر تسلیم کیے جانے کے لیے درکار تمام شرائط کو پوری کرتا ہے۔ لنگایت ہندو مذہب کے بیشتر پیروکاروں کے برعکس ایک خدا میں یقین رکھتے ہیں اور ان کے خدا ہندو مذہب کے ایک اہم دیوتا شیوا ہیں جن سے مراد آفاقی طاقت یا شکتی سے ہے۔ انڈیا میں ہندوازم یا مذہب اپنے وجود کے ابتدائی دنوں سے ہی بحث و مباحثے کے لیے ہمیشہ کھلا رہا۔ اس مذہب میں ایک خدا پر یقین رکھنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں تو دوسری جانب بہت سے خداؤں پر یقین رکھنے والے پیروکار بھی ہیں۔ یہیں پر ایسے بھی سادھو اور فلسفی پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف کسی خدا کے وجود سے انکار کیا بلکہ دہریت کی ایک منظم تحریک چلائی اور تمام مسلمہ مذہبی تصورات کو چیلنج کیا۔ مورتی کی پرستش کرنے والے لوگ ہیں تو بہت سے ایسے ہیں جو مورتی پوجا کے خلاف ہیں۔ مذہب کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے مذہبی عقیدے کی پروا کیے بغیر مذہبی عالموں کے بحث و مباحثوں اور مناظروں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ہندوازم سے ہی آگے چل کر جین، بدھ اور سکھ مذاہب بھی بالکل الگ مذہبی تصورات کی شکل میں وجود میں آئے۔ ہندوازم کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ مذہب نہیں فلسفۂ حیات ہے۔ یہ مسلسل ارتقا میں ہے اور نئی قدروں اور نئے تصورات سے یہ خود کو وسیع کرتا گیا ہے۔ یہیں مورتی پوجا کی مخالفت ہوتی ہے اور یہیں کروڑوں لوگ اس کی پوجا کر رہے ہوتے ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے انتخاب میں بھی لوگ اپنی اپنی پسند کے لیے آزاد ہیں۔ درجنوں مسلک، سینکڑوں تصورات اور متعدد دیوی دیوتاؤں کے باوجود ہندوازم میں کبھی کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ کوئی مٹھ، مندر یا کوئی مذہبی رہنما کسی کو غیر ہندو قرار نہیں دیتا، کسی کو بدعتی نہیں کہا جاتا۔ مسلکوں کے نام پر تشدد اور خونریزی نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ کروڑوں لوگ جو ہندو مذہب چھوڑ کر چلے گئے انھیں بھی کبھی گنہگار، منحرف یا منافق نہیں سمجھا جاتا۔ یورپ کو چھوڑ کر شاید دنیا میں بہت کم ایسے مذہبی معاشرے ہوں گے جہاں کرناٹک کی طرح ہزاروں کی تعداد میں لنگایت جمع ہو کر خود کو ہندو مذہب سے علیحدگی کا مطالبہ کریں اور انھیں کوئی برا بھلا بھی نہ کہے۔ لاکھوں دلت ہندو مذہب سے نکل کر بودھ مذہب اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن ہندوازم یا ہندو مذہب کی روادادی اور تصورات کی وسعت کو اب ہندوتوا کے چیلنج کا سامنا ہے۔ ہندوازم کے برعکس ہندوتوا سیاسی مذہب ہے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد، مذہبی تنگ نظری، منافرت اور سخت گیریت کے تصور پر قائم ہے۔ وہ مختلف رنگوں کے ہندوازم کو ایک واحد رنگ میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس تصور کے تحت لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ لوگوں کے رہن سہن اور کھانے پینے کے طریقوں تک کو متاثر کیا جاتا ہے۔ اس فلسفے کے تحت انسانوں کو اپنوں اور غیروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے معاشرے میں نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ اس کا طویل مدتی مفاد مذہبی نہیں سیاسی ہے۔ مذہبی قوم پرستی کے اس دور میں انڈیا کی جمہوریت ہی نہیں ہندو مذہب کی رواداری اور اعتدال پسندی کی عظیم روایات کو بھی ابھرتی ہوئی سخت گیریت اور تنگ نظری سے شدید خطرہ لاحق ہے لیکن انڈیا کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب بھی تاریک پرستوں نے مذہبی رواداری کو تباہ کرنے کی کوشش کی یہ روایات پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو کر ابھری ہیں۔

انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کی سرحد پر 'ڈاکوؤں کا چھوٹا سا ملک'

ڈیبیٹ ایبل لینڈز کا قدرتی ماحول آج بھی اسی طرح جنگلی ہے جس طرح بارڈر ریورز کے دور میں تھا

دنیا میں کہیں بھی سردیوں کی دھوپ سکاٹ لینڈ کے مغربی ساحل جیسی نہیں ہے۔ جب میں دریائے اسک کے اس پار دیکھتی ہوں تو ہلکے پیلے رنگ کی سورج کی شعائیں دریا کے پانیوں کی لہروں سے منعکس ہو کر ایک شیشے کے فیتے کا منظر پیش کرتی ہیں۔ اس کے اردگرد کھیت سلووے فرتھ کی جانب جاتے ہیں۔ ایک طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی ساحل سمندر کی نچلی سطح آئرش سمندر تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں سکاٹ لینڈ کے ڈمفرائی اور انگلینڈ کے گیلووے میں ایک قدرتی دیوار بن جاتی ہے۔ میں تیز ہوا کے سامنے ڈٹ کر انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے بارڈر کے جنوب مغربی کنارے کا معائنہ کر رہی تھی۔ قدرت کے نظاروں کا لطف لیتے ہوئے آپ کو یقین نہیں آتا کہ بظاہر پرامن دیہی علاقہ ایک وقت میں لاقانونیت کا مرکز اور خونی علاقہ تصور کیا جاتا تھا جسے 'ڈیبیٹ ایبل لینڈز' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تین سو برس تک لاقانونیت کا یہ مرکز آج ایک پرسکون دیہی علاقہ ہے جہاں قدرے سخت جان جانوروں کی افزائش کی جاتی ہے اور یہاں کے قصبوں اور دیہاتوں میں ہم آہنگی جھلکتی ہے۔ برطانیہ کے اس علاقے میں آپ کو ان لوگوں کی کہانیاں ملتی ہیں جو ڈیبیٹ ایبل لینڈز کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور یہاں کے لڑاکا خاندان بارڈر ریورز کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کی مقامی تاریخ، یہاں کے دریاؤں اور جنگلوں کی گھاٹیوں میں چھپی ہے جسے زیادہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اور یہ کیا دلچسپ کہانی ہے۔ ڈیبیٹ ایبل لینڈز برطانیہ میں علاقے کا آخری بٹوارہ تھا۔ یہاں تیرہویں سے سولہویں صدی تک علاقے کے قبائل نے خوب لوٹ مار کی اور بے بہا خون بہا۔ ڈیبیٹ ایبل لینڈز میں انتشار اور لاقانونیت کا عروج تھا۔ باوجود اس کے کہ یہ علاقہ آزاد اور مختار نہیں تھا لیکن اتنا خطرناک تھا کہ نہ تو انگلینڈ اور نہ ہی سکاٹ لینڈ نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ ڈیبیٹ ایبل لینڈز کی تاریخ برطانیہ اور سکاٹ لینڈ کی حکومت کی جانب سولہویں صدی کے وسط میں جاری ہونے والے پارلیمانی فرمان میں سمودی گئی ہے۔ اس پارلیمانی فرمان کی رو سے: انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے لوگ کسی کو لوٹنے، جلانے، قتل کرنے، تباہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور کسی ایسے شخص کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی جاسکتی۔

اس پارلیمانی فرمان کو قانون کا درجہ دیا گیا تھا۔ اس پارلیمانی فرمان کی وجہ ذمہ داری سے بچنے کی کوشش تھی کیونکہ کوئی فریق اس علاقے کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ جب سکاٹ لینڈ اور انگلینڈ دونوں کا اس پر اتفاق نہ ہو سکا کہ یہ کس کا علاقہ ہے تو اس علاقے کو بانٹ لیا گیا۔ نیشنل میوزیم سکاٹ لینڈ کی پرنسپل کیوریٹر ڈاکٹر اینا گراؤنڈ واٹر نے مجھے بتایا کہ یہ علاقہ اپنے خدوخال کی وجہ سے کسی کے کام کا نہیں تھا۔ نہ تو یہاں قیمتی زمین تھی جہاں فصلیں اگتیں۔ لہذا کوئی بھی اس کو کنٹرول کرنے کے لیے لڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا علاقہ بھی تھا، جس نے مجھے اس وقت متاثر کیا جب میں نے سکاٹش شہر گریٹنا کے شہر میں واقع ایک کچن میں گرما گرم چائے کے انتظار میں نقشے کا جائزہ لیا۔ یہ علاقہ صرف آٹھ میل چوڑا اور پہاڑی چوٹی سے نیچے ساحل تک صرف تیرہ میل لمبا ہے۔ اے سیون روڈ جو ایڈنبرا اور کارلائل کو ملاتی ہے، وہ اس علاقے سے گزرتی ہے جو ایک وقت ڈیبیٹ ایبل لینڈز کہلاتا تھا۔ گریٹنا اور اس کے گرین کو گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والوں کی جنت کہا جاتا ہے لیکن اس کی شہرت اس کے علاوہ بھی ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں وہاں صنعتی سطح پر اسلحہ اور بارود کی تیاری ہوتی تھی جس کی وجہ سے وہاں کی ساری آبادی میں تبدیلی آئی۔ یہاں کی تعمیرات بیسویں صدی کے اوئل کی عکاسی کرتی ہیں۔ میں جس کیفے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی وہ بھی اسی فن تعمیر کا مظہر ہے۔ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ میں 1237 میں ٹریٹی آف یارک کے تحت پہلی بار سرحدوں کا تعین ہوا۔ دی ڈیبیٹ ایبل لینڈ: دی لاسٹ ورلڈ بیٹوین سکاٹ لینڈ اینڈ انگلینڈ ※ کے مصنف گراہم راب لکھتے ہیں کہ 1237 میں انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے مابین سرحدوں کے تعین کا شاید یہ یورپ میں پہلا ایسا واقعہ تھا۔ لیکن جب سرحد کے تعین کا عمل ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ مختلف خاندانوں کی جائیدادوں کے درمیان لکیر کھینچ دی گئی جس سے لوگ سخت ناراض ہوئے اور اس ناراضی نے بغاوت کی سی شکل اختیار کر لی۔

سرحد کی لکیر کھینچے جانے کے بعد یہاں کے طاقتور خاندانوں نے انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ میں لوٹ مار کرنی شروع کر دی اور دونوں میں سے کوئی حکومت بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اپنی وسائل خرچ کرنے پر تیار نہ تھی۔ یہ علاقہ نو گو ایریا بن گیا جہاں سرحدی ڈاکوؤں جنھیں مقامی زبانی میں 'بارڈر ریورز' کے طور پر جانا جاتا تھا، کی آماجگاہ بن گیا۔ ریونگ سکاٹش زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں لوٹ مار کرنا۔ بارڈر ریورز نے ایک دوسرے کے مال مویشی چوری کرنے شروع کر دیے۔ ڈاکٹر اینا گراؤنڈ واٹر کہتی ہیں کہ یہ وارداتیں نہ صرف بارڈر کے پار ہوتی تھیں بلکہ سکاٹ لینڈ اور انگلینڈ میں بھی ایسی وارداتیں عام تھیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے جھگڑے سے زیادہ جرائم پیشہ لوگوں کی کارروائیاں تھیں۔ بارڈر ریورز کی کارروائیاں صرف ڈیبیٹ ایبل لینڈز تک محدود نہیں تھیں۔ ان کی سب سے خونی کارروائیاں ایسے علاقوں میں تھیں جن کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا کہ کوئی انھیں چھو بھی نہیں سکتا۔ بارڈر ریورز کی کارروائیوں کی وجہ سے ڈیبیٹ ایبل لینڈز برطانیہ کا انگلینڈ، ویلز اور سکاٹ لینڈ کے بعد عملاً چوتھا ملک بن گیا جہاں اس کے اپنے اصول اور ضابطے تھے اور کوئی اس علاقے میں گھس نہیں سکتا تھا۔ ڈیبیٹ ایبل لینڈ کی سرزمین بنجر اور وہاں آبادی بہت کم ہے۔ کینبی اور لینگہوم کی آبادی ڈیبیب ایبل لینڈز کے رہائش پذیر لوگوں کی اولادیں ہیں۔ اب کینبی اور لینگہوم ماہی گیری اور ہائیکنگ کے مرکز ہیں۔ ڈیبیٹ ایبل لینڈز کی نشانیاں اب بھی موجود ہیں جن میں 173 میل طویل ریورز سائیکل روٹ بھی ہے۔ میں نے اے سیون روڈ پر ایک چکر لگا کر رونبرن نامی گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اب بھی پبلک گارڈن ہے جہاں لینگ سینڈی کا لکڑی کا مجسمہ لگا ہوا ہے۔ لینگ سینڈی کا قد چھ فٹ سے زیادہ جو سولویں صدی میں بہت طویل القامت تصور ہوتا تھا۔ لینگ سینڈی کا اصلی نام الیگزینڈر آرمسٹرانگ تھا اور وہ ڈیبیٹ ایبل لینڈز کے طاقتور ترین قبیلے کے آخری سردار تھے جس کی اپنے علاقے میں عزت بھی بہت تھی اور ان کا دبدبہ بھی بہت تھا۔ لینگ سینڈی نے برطانیہ کے بادشاہ کی طرف علاقے میں قانون کی عملداری کو قائم کرنے کی کوششوں کی سخت سے مخالفت کی اور انھیں 1610 میں اپنے گیارہ بیٹوں کے ہمراہ پھانسی دی گئی تھی۔ لینگ سینڈی کے علاوہ اور بہت سارے بارڈر ریورز کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔

آرمسٹرانگ قبیلے کا گلنا کی ٹاور آج بھی محفوظ ہے۔ میں رونبرن سے چند منٹوں کی مسافت کے بعد گلنا کی ٹاور کے علاقے کا دورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں تھوڑی دیر میں گلنا کی ٹاور کی سڑک پر موجود تھا جو سکاٹ لینڈ کے لولینڈ کے پیل ٹاور کا خوبصورت نمونہ ہے۔ یہ اب ڈیبیٹ ایبل لینڈز کے آرمسٹرانگ قبیلے کا میوزیم ہے۔ گلنا کی ٹاور اپنے قریب واقع گاؤں ہالوز کی وجہ سے ہالوز ٹاور کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ پانچ سو سالہ پرانا ٹاور دفاعی نکتہ نظر سے تیار کیا اور اس کی پتھر کی دیواروں کو توڑنا ناممکن تھا۔ ٹاور کے منتظم مارٹن نے مجھے بتایا کہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس میوزیم کو سارا سال عوام کے کھلا رکھا جائے۔ مارٹن نے بتایا کہ پیشگی بکنگ کے ذریعے ٹورز کی بھی اجازت ہے۔ ان ٹورز کا انتظام کرنے کا مقصد سولویں صدی کی زندگی کی عکاسی کرنا ہے۔ ان ٹورز میں سولویں صدی میں فیملی لائف کی بھی جھلک دکھائی جاتی ہے کہ وہ ادوار کتنے مشکل تھے۔

جب میں مارٹن کے ساتھ اے سیون روڈ کے قریبی علاقوں کے بارے میں بات کر رہا تھا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ یہاں سیاحوں کو علاقے کی طرف متوجہ کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ جب آپ بارڈر لینڈز سے کینبی، گلنا کی ٹاور اور لینگہوم کی طرف ڈرائیو کرتے ہیں تو ٹیکسٹائل انڈسٹری کی تاریخ آپ کے سامنے آتی ہے۔ مارٹن کہتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کو اکٹھا کیا جا رہا ہے تاکہ لوگوں کو اس علاقے میں سیر پر آنے کے لیے قائل کیا جا سکے کیونکہ یہ علاقہ بہت عرصے سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ البتہ بارڈر ریورز کے لیے علاقے کی دوری پریشانی کا سبب نہیں تھا۔ درحقیقت ڈیبیٹ ایبل لینڈز سولویں صدی کے وسط تک انتہائی تنہائی میں رہا ہے۔ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے مابین پہلی مرتبہ 1551 میں ہونے والے معاہدے کے بعد 1552 میں سکاٹ ڈائیک تعمیر ہوئی جس نے انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کی باونڈری کو ہمیشہ کے لیے متعین کر دیا۔ ساڑھے تین میل تک بنائے گئے پشتوں نے ڈیبیٹ ایبل لینڈز کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان پشتوں کے کچھ آثار اب بھی موجود ہیں۔ ابتدا میں ان پشتوں کی حیثیت صرف نمائشی ہی تھی اور سے بارڈر ریورز کی کارروائیوں پر کوئی اثر نہ پڑا اور چوری ڈاکے کی وارداتیں پہلے کی طرح جاری رہیں۔ جب 1603 میں انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کا الحاق ہوا تو اس وقت برطانیہ کی بادشاہت کی توجہ اس سرحد پر مرکوز ہوئی۔ اس علاقے میں قانون کی عملداری کو یقینی بنانے کے لیے نئے نگران تعینات کیے گئے۔ علاقے کو چوروں ڈاکوؤں سے پاک کرنے کے لیے لینگ سینڈی جیسے بہت سے بارڈر ریورز کو پھانسی لگا دی گئی اور کئی کو ملک بدر کر دیا گیا۔ جب میں اے سیون روڈ پر شمال کی طرف بڑھ رہا تھا تو میری پشت گلنا کی ٹاور تھا جسے میں اپنی کار کے شیشے میں دیکھ سکتا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ کیسے حکومتوں کے علم میں ہوتے ہوئے صدیوں تک اس چھوٹے سے علاقے میں اتنی لاقانونیت پھیلی رہی اور کئی دلچسپ کردار اور کہانیاں پروان چڑھتی رہیں۔ ڈیبیٹ ایبل لینڈ میں دلچسپی کی وجہ بھی نہ سمجھ آنے والے ادوار تھے۔ یہاں کے قصبے، گاؤں کے آس پاس کا قدرتی ماحول آج بھی اسی طرح جنگل بیابان ہے جیسے بارڈر ریورز کے زمانے میں تھا۔ (بشکریہ بی بی سی)

ایشیا کا وہ ملک جو راتوں رات ہی مالدار ہو گیا

دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان آبادی والے ملک انڈونیشیا میں متوسط طبقے میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ دارالحکومت جکارتہ سے ہماری نمائندہ ریبیکا ہنشکے کہتی ہیں کہ ان نئے امیروں کو انڈونیشیا کے (کریزی رِچ) یعنی سر پھرے نو دولتیے کہا جا رہا ہے۔ یہاں ان کی کہانی ان کی زبانی پیش کی جا رہی ہے۔ ہمارے فرج کے دروازے پر لگے ایک رنگا رنگ دعوت نامے سے معلوم ہوا کہ (کتے کی تھیم) پر مبنی ایک برتھ ڈے پارٹی میں مدعو کیا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ بہت پیاری چیز ہے اور قدرے مختلف بھی، کیوں کہ عام طور پر جکارتہ میں کتوں کو نہ زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور نہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال ہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ واحد حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ ایک دولت مند خاندان اپنی چھوٹی بیٹی کی چھٹی سالگرہ کے لیے جکارتہ کے سب سے مہنگے علاقے میں ایک اراضی کو اس دن کے لیے پارک میں تبدیل کر دیا تھا۔ سکیورٹی گارڈز ہمیں ایک گلی سے ہو کر ایک دوسری ہی دنیا میں لے گئے۔ وہاں حقیقی گھاس بچھائی گئی تھی جو کہ کنکریٹ کے اس جنگل میں یقیناً ایک نادر چیز تھی۔ وہاں بھرپور درخت بھی تھے اور کتوں کے لیے ایک باڑا بھی تھا۔ ایک کونے میں کتوں کی نشوونما کرنے والا ایک شخص تھا جسے اس خاص موقعے کے لیے لایا گیا تھا اور وہ کتوں کی مالش کر رہا تھا اور انھیں غسل دے رہا تھا۔

دوسرے کونے میں ایک ایئر کنڈیشنڈ خیمہ تھا جہاں بچوں کے والدین تازہ بنی ہوئی آئس کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور بعد میں شراب کا دور چلا تھا۔ یہاں الکوحل پر زیادہ ٹیکس عائد کیا جاتا ہے جس کا مطلب تھا کہ یہاں شراب مہنگی ملتی ہے۔ پارک کا مرکزی حصہ کتوں کی شکل کے غباروں سے بھرا تھا۔ ایک شخص بلبلے اڑا رہا تھا اور جبکہ ایک جگہ چکنی گیلی مٹی سے طرح طرح کے اجناس بنانے کا انتظام تھا۔ یہ اکتوبر کا مہینہ تھا اور میں سولاویسی جزائر میں پالو کی تباہی کی رپورٹنگ کر کے واپس آئی تھی۔ یہ علاقہ سونامی اور زلزلے کی تباہ کاریوں کی زد میں تھا۔ یہاں آ کر مجھے عجیب احساس ہوا اور سب کچھ ماورائے حقیقت نظر آیا۔ اس سے آگے اب کیا ہو گا؟ میں نے ایک دوسرے والدین کے کانوں سرگوشی کی۔ اگر اسی طرح چلتا رہا تو 18 ویں سالگرہ کی پارٹی میں کیا ہو گا؟

انھوں نے جواب دیا: بچے اس قسم کا مطالبہ نہیں کرتے، درحقیقت یہ ان کے والدین کی خواہشات کا اظہار ہے۔ پارٹی سے ہم جو تحائف لے کر نکلے وہ ان تحائف سے تین گنا زیادہ تھے جو ہم لائے تھے۔ مجھے پتہ نہیں کہ اب تک میں حیرت زدہ کیوں ہوں۔ اس قسم کی پارٹیاں انڈونیشیا کے ان امیر گھرانوں کے بچوں میں عام ہے اور معمول کا حصہ ہے جن کے ساتھ میرے بچے سکول جاتے ہیں۔ ایک خاندان نے تو ایک فلم کمپنی کو بلایا تھا تاکہ وہ ہالی وڈ کی فلم (سوسائڈ سکواڈ) کو اس طرح ایڈٹ کرے کہ جس بچی کی سالگرہ منائی جا رہی؛ ہے وہ اہم مناظر میں اس فلم کا کردار نظر آئے۔ بچوں نے اس ایڈٹ کردہ فلم کو سینما جیسے بڑے سکرین پر ایک ہوٹل کی چھت پر موجود بال روم میں دیکھا۔ اس موقعے پر میں ایک دوسرے دور دراز صوبے پاپوا سے واپس آئی تھی جہاں بچے کھانے کی کمی کے سبب مر رہے تھے اور جہاں خسرے کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ جب فلم (کریزی رچ ایشیئنز) ریلیز ہوئی تھی تو لوگوں نے سماجی رابطے کی سائٹ ٹوئٹر پر (کریزی رچ انڈونیشیئنز) کی کہانیاں بیان کی تھی جس میں بطور خاص ملک کے دوسرے بڑے شہر سورابایا کی کہانیاں زیادہ تھیں۔ (کریزی رچ سورابائین) اس وقت ٹوئٹر پر ٹرینڈ کرنے لگا جب ایک امیر طبقے کے سکول کی ٹیچر نے ایک خاندان کے بارے میں پہلیاں بجھانی شروع کی کہ اس خاندان کا نام بتاؤ جو ٹیکہ جاپان میں لگواتا ہو اور چھٹیاں یورپ میں گزارتا ہو۔ اب وہ اس کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہی ہیں جس پر فلم بنانے کی بات کی جا رہی ہے۔ حال ہی مقامی میڈیا نے سورابایو میں ہونے والی ایک شاہانہ شادی کو (سر پھرے امیر سورابائینز) کا نام دے دیا۔ اس میں انڈونیشیا اور بیرون سے سینکڑوں مہمانوں نے شرکت کی اور کہا جاتا ہے کہ اس دوران ایک جیکوار سپورٹس کار جیتنے کے لیے قرعہ اندازی بھی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ دولھے نے ویشین مکاؤ ریزارٹ میں سینکڑوں اجنبیوں کے سامنے دلھن کو شادی کے لیے پروپوز کیا تھا۔ یہ اجنبی فلیش ماب یعنی یکا یک کسی جگہ جمع ہو جانے والی بھیڑ کے ذریعے اکٹھے کیے گئے تھے۔ انڈونیشیا کے ترقی پذیر متوسط طبقے کے لوگ ملک کے مغربی علاقوں میں مرکوز ہو رہے ہیں، ان کے پاس اتنے پیسے ہیں جتنا کبھی ان کے والدین نے خوابوں میں بھی نہ سوچے ہوں۔ اور زیادہ تر لوگ اسے معمول کی چیز اور ضروری سمجھتے ہیں تاکہ دکھاوا کیا جا سکے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں انڈونیشیا میں غربت میں تیزی سے کمی آنے کے نتیجے میں اب ہر پانچ میں سے ایک آدمی متوسط طبقے میں شامل ہو گیا ہے۔

اس کے بعد سے وہاں مصنوعات کا سیلاب سا آ گیا ہے۔ یہ نو دولتیے اس جزائر کے سلسلے میں وسیع قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال کر رہے ہیں جن میں لکڑیاں، روغن

تاڑ، کوئلہ، سونا اور کانسی شامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ جارحانہ دیسی سرمایہ کاری، کم ٹیکس اور مزدوری کے قانون کے نفاذ کی عدم موجودگی کا بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں جو نظام کی کمزوریوں سے واقف ہیں۔ سلیمون ان لوگوں میں سے ایک ہیں جو نظام کو نہیں سمجھتے لیکن انھوں نے بھی ایک طرح سے اپنے بچوں کا مستقبل بنایا ہے جو ان کی اپنی زندگی سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ وہ جاروب کش ہیں اور ماہانہ ڈھائی سو ڈالر کماتے ہیں۔ وہ مینٹینگ کے امیر گھروں کے کوڑے لے جاتے ہیں جن میں کوڑے کے ڈھیر ہوتے ہیں اور جو بے لگام صارفیت کا مظہر ہیں۔ انھوں نے بے کار لکڑیوں سے ایک ٹھیلہ تیار کیا ہے جسے وہ ہاتھوں سے کھینچتے ہیں۔ میں نے اب تک جتنے مضبوط لوگ دیکھے ہیں ان میں وہ سب سے زیادہ مضبوط ہیں۔ میرے بچے اسے سپر مین کہتے ہیں۔ وہ ایسی تمام چیزوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں جس کی کوئی قیمت مل سکے۔ وہ ان کو چھانٹتے ہیں اور ہمارے یہاں جمع کرتے ہیں اور پھر اسے فروخت کر دیتے ہیں۔ سلیمون ہمارے گھر کے عقب میں ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ وہ دراصل اسی کے ساتھ آئے ہیں۔ جب ہم نے کرایے پر وہ مکان لیا تو وہ وہاں اکڑوں بیٹھے اور وہاں رہتے تھے اور ہم نے انھیں رہنے کے لیے پیچھے بنا کمرہ دے دیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ بحث و مباحثے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا۔ اب ہمارے بچے انھیں ماموں کہتے ہیں۔ وہ فطری طور پر کسان ہیں اور انھوں نے ہمارے سوئمنگ پول کو مچھلیوں کا تالاب بنا دیا ہے جبکہ باغیچے کو کیلے کے باغ میں تبدیل کر دیا ہے۔ جب میں نے اپنی الماریاں صاف کیں تو ایک پرانی ہائی ہیل جوتی کو باہر چھوڑ دیا کہ کسی کو دے دوں گی۔ میں نے دیکھا کہ اس جوتی کو اس نے پہن رکھا ہے۔ اس نے ہیل کاٹ دی تھی اور وہ اسے مزے سے پہنے پھر رہا تھا۔ جو کچھ وہ کماتا ہے اسے وہ وسطی جاوا کے ایک دیہات میں آباد اپنے اہل خانہ کو بھیج دیتا ہے اور سال میں صرف ایک بار ان سے ملنے جاتا ہے۔ امیروں کے کوڑے سے کمائی جانے والی دولت سے اس کے بچوں نے ہائی سکول پاس کر لیا ہے اور اب جکارتہ کے چمکتے ہوئے مالز میں فروخت ہونے والی مصنوعات کو بنانے کا کام کرتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ (آئی پیڈ کیا ہوتا ہے؟ میرے بیٹے کا کہنا ہے کہ اسے اس کی واقعی ضرورت ہے۔ وہ کس طرح کام کرتا ہے؟) میں نے اس سے بات کی اور اس کا ایک سستا متبادل بتایا۔ اس کی بیٹی مختصر سے عرصے کے لیے اس کے ساتھ رہنے آئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے فون میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔ سلیمون شاید سر پھرے امیر نہ بن سکیں لیکن ان کی آنے والی نسل ابھی سے پکی صارف بن چکی ہے۔

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں کہ کام کا نہیں
اُلٹی شکایتیں ہوئیں، احسان تو گیا

دیکھا ہے بُت کدے میں جو اے شیخ، کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا، جان تو گیا

گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا، پر ہزار شکر
مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

بزمِ عدو میں صورت پروانہ دل میرا
گو رشک سے جلا تیرے قربان تو گیا

ہوش و ہواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

داغ دہلوی

سعودی عرب: درسی نصاب تعلیم میں اہم تبدیلیاں

تحریر: ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ (آسٹریلیا)

اسرائیل مخالف اور جہادی مواد، نیز ارتداد اور ہم جنس پرستی کی سزاؤں کا ذکر حذف

(امپیکٹ۔ایس ای)(Institute for Monitoring Peace and Cultural Tolerance in School Education) IMPACT-se ایک ایسا تحقیقی ادارہ ہے جو اقوام متحدہ کے ذیلی ادارہ یونیسکو کی بتائی ہوئی تعلیمی ہدایات کی روشنی میں دنیا بھر کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی ٹیکسٹ بکس اور تعلیمی و درسی نصابوں کا گاہے بگاہے جائزہ لے کر اپنی رپورٹ اور سفارشات شائع کرتا ہے تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ کون سا ملک کس طرح سے اپنی نئی نسل کو کس قسم کی تعلیم بہم پہنچا رہا ہے۔ گزشتہ برس دسمبر 2020 میں اسی ادارہ نے سعودی عرب کی درسی کتب اور تعلیمی نصاب کے بارہ میں رپورٹ شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سعودی عرب نے (امریکہ کی مشاورت سے۔ ناقل) اپنے ہاں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں میں چند اہم اور "مثبت" تبدیلیاں کی ہیں۔

(https://www.impact-se.org/saudi-arabia/)۔

ان تبدیلیوں کے نتیجے میں نئی درسی کتابوں میں سے یہود مخالف اور جہادی مواد، نیز ارتداد اور ہم جنس پرستی کی سزاؤں کا ذکر حذف کر دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سعودی نصاب میں کی جانے والی تبدیلیاں سعودی عرب کے نئے معاشی و ثقافتی پروگرام (ویژن) کا حصہ ہیں۔ رپورٹ کے مطابق درسی کتب میں تاحال مندرجہ ذیل قابل ذکر اور نمایاں تبدیلیاں کی گئی ہیں:

1۔ یہ جملہ کہ "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اسلام کی معراج ہے" حذف کر دیا گیا ہے۔

2۔ جہاد سے متعلق سورۃ التوبہ کی آیات 41 تا 68 اور ان کی تفصیلی تشریح اور تفسیر پر مبنی ایک پورا باب (ٹیکسٹ بک یونٹ) نئی کتاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

3۔ ایک پورا پیراگراف جو اس تعلیم پر مشتمل تھا کہ "منکرین اسلام کے ساتھ دشمنی ایمان کا جزو لاینفک ہے"، حذف کر دیا گیا ہے۔

4۔ ایک ایسی حدیث کو بھی حذف کر دیا گیا ہے جو ایک پیشگوئی پر مشتمل ہے جس کے مطابق آئندہ زمانہ میں ایک ایسی ناگزیر جنگ ہوگی جس میں مسلمان دنیا میں موجود سارے یہودیوں کو قتل کر دیں گے۔ رپورٹ کے مطابق اس حدیث کی وجہ سے مسلمان طلباء کے دلوں میں یہودیوں کے خلاف غصہ اور جارحیت کے ہیجان انگیز جذبات پروان چڑھتے تھے۔ رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی حدیث ہے جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے دلوں میں یہودیوں کے خلاف سخت نفرت، دشمنی و عناد پیدا کرنے کا سبب بن رہی تھی اس لیئے اس حدیث کو نئے سعودی نصاب میں سے حذف کر دیئے جانے کا اقدام بہت ہی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

5۔ ایک ایسا پورا باب ہٹا دیا گیا ہے جو کہ سورۃ البقرہ کی ایک ایسی آیت کی تفسیر اور تشریح پر مبنی تھا جس میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ یہود کے نقش قدم پر مت چلیں اور ان کی مشابہت مت اختیار کریں۔

6۔ پڑھایا جاتا تھا کہ چونکہ یہود پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے منکر ہیں اس لئے ان کا مذہب یا تاریخ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ نئے نصاب سے یہ جملہ بھی حذف کر دیا گیا ہے۔

7۔ یہ جملہ بھی حذف کر دیا گیا ہے کہ صیہونی قوتیں اور ان کے ایجنٹ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے پیسوں، عورتوں اور منشیات کو استعمال میں لاتے ہیں۔

8۔ اسی طرح یہ "اسلامی" نظریہ کہ قیامت کے روز سب سے پہلے یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا، بھی نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

9۔ ایک ایسے پیراگراف کو بھی نئے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا جس میں درج تھا کہ دنیا میں مرتد کی سزا قتل ہے اور آخرت میں جہنم۔

10۔ اسی طرح سے ایک اور تفصیلی پیراگراف کو بھی نئے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے جس میں قوم لوط کے حوالے سے ثابت کیا گیا تھا کہ لواطت اور ہم جنس پرستی ایک گھناؤنا جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ یہ بھی پڑھایا جاتا تھا کہ ہم جنس پرستی کی وجہ سے دنیا میں قدرتی آفات بھی آتی ہیں اور وبائیں بھی پھیلتی ہیں۔

11۔ اسرائیل سے متعلق نفرت پر مبنی بہت سارے مواد کو بھی نئے نصاب میں سے حذف کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ "صیہونی خطرہ" کے عنوان سے نصاب میں موجود ایک پورا باب حذف کر دیا گیا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ یہودی صیہونی لابی کس طرح پوری دنیا کو اکٹوپس کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑنے کے لئے منظم طور پر سرگرم عمل ہے اور باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ اس پر کام کرتی ہے۔

ٹائمز آف اسرائیل کے مطابق ربی روزن نے، جو کہ امریکی یہودی انجمن کی بین المذاہب کمیٹی کے ڈائریکٹر ہیں، اپنے حالیہ دورہ سعودی عرب میں امپیکٹ ایس ای کی اس رپورٹ کی کاپی سعودی عمائدین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ سعودی محکمہ تعلیم کی طرف سے مستقبل میں اس سلسلہ میں مزید بہتری دیکھنے کو ملے گی۔ اخبار کے مطابق سعودی نصاب میں کی گئی مذکورہ تبدیلیوں کو سعودی اسرائیل تعلقات میں انقلابی اور مثبت پیش رفت کے پیش خیمہ کے

طور پر دیکھا جا رہا ہے۔تاہم اخبار کا کہنا ہے کہ سعودی نصاب میں مزید بہتری کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی بھی اس میں ایسے قرانی حوالہ جات درج ہیں جن کے مطابق یہود ایک ایسی قوم ہیں جن سے خدا تعالیٰ ناراض ہو چکا ہے اور سزا کے طور پر خدا نے انہیں بندر بنا دیا تھا۔(ٹائمز آف اسرائیل 17 دسمبر 2020)۔یہودیوں کے علاوہ عیسائیوں اور دیگر"غیر"مزاہب والوں کے خلاف جارحانہ جذبات بھڑکانے والا مواد بھی حذف شدہ حصہ میں شامل ہے۔سعودی نصاب حکومت کے محکمہ تعلیم کی ویب سائٹ پر دستیاب ہوتا تھا اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سنی مدرسوں اور تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور طلباء اس سے"استفادہ"کرتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ درسی کتابوں میں موجود نفرت،عسکریت اور انتہا پسندی پر مبنی تعلیمات اسلام کے وہابی فرقہ کے بانی محمد ابن عبدالوہاب کے ساتھ آل سعود کے مبینہ خاندانی تعلق اور مسلکی عقیدت کا نتیجہ تھی۔مخصوص وہابی عقائد کو درسی کتابوں کا حصہ بنایا گیا اور اس کے صلے میں وہابی علماء کی طرف سے حاکم وقت کی کامل اطاعت کو اول اسلامی فریضہ قرار دیئے جانے کے فتوے جاری کئے گئے۔جب تک متشدد اور نام نہاد"جہادی"مواد مغربی طاقتوں کے حق میں مثلاً (افغان جہاد) میں کام آتا رہا انہوں نے اس طرف سے نہ صرف اعراض برتے رکھا بلکہ مبینہ طور پر اسی کی بنیاد پر بڑی بھاری تعداد میں جہادی لٹریچر تیار کروا کر اسلامی ممالک میں پھیلایا جس کا اعتراف سعودی عرب کی ایک انتہائی مقتدر شخصیت بھی کر چکی ہے۔لیکن"نائن الیون"کے بعد سے انہی مغربی طاقتوں خصوصاً امریکہ کی طرف سے اس قسم کے مواد پر بتدریج پابندی عائد کر دی گئی۔زیادہ تر عالمی مبصرین کا کہنا ہے کہ مذکورہ اقدامات دراصل سعودی عرب کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی طرف پہلا رسمی قدم ہے جس کے ذریعہ سنی عالم اسلام میں یہودیوں اور اسرائیل کے بارہ میں پھیلائی گئی منفی تعلیم کا اثر ذائل کرنا ہے۔قارئین کو یاد ہوگا کہ اس سے قبل ستمبر 2020 میں امام کعبہ کے ایک ایسے خطبہ کو بھی (متنازعہ) اور معنی خیز قرار دے دیا گیا تھا جس میں آپ نے یہودیوں سمیت تمام غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کو عین اسلام اور سنت نبوی ﷺ قرار دیا تھا۔ناقدین کا کہنا تھا کہ یہ وہی امام کعبہ ہیں جو چند دہائیاں قبل اسرائیل اور یہودیوں کو اپنے خطبوں میں شدید تنقید کا نشانہ بناتے نہ تھکتے تھے۔اسرائیل سمیت دنیا کے عالمی میڈیا نے امام کعبہ کے اس خطبہ کی"ٹائمنگ"کو نہایت معنی خیز قرار دیا تھا۔جبکہ متعدد اسلامی مبصرین نے آپ پر منبرِ رسول کے (ناجائز استعمال) کا الزام لگا کر ان کی کھلی مذمت کی تھی۔دعا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں اور ان کے مذہبی و سیاسی رہنماؤں کو اللہ تعالیٰ اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ دنیاوی،وقتی اور ذاتی مفادات کی خاطر غیر قوموں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر آئے روز نت نئے کرتب دکھانے کی بجائے تقویٰ،اعتدال اور عقل سے کام لینے کی توفیق عطا فرمائے کہ حقیقی اسلام شروع دن سے اتحاد،امن اور اعتدال کی تعلیم دینے والا مذہب ہے۔

❁❁❁

دوالمیال گاؤں کی تاریخی توپ

دوالمیال کی پہچان یہ توپ ہماری
اسلاف کی نشان یہ توپ ہماری
دنیا میں دو توپیں انعام ملی تھیں
اِک یورپ اِک ایشیا کے نام ملی تھیں
یہ گاؤں کو پہلی جنگ عظیم کا انعام ملا تھا
دلیر، بہادری کے کام کا یہ ایک صلہ تھا
کپتان غلام محمد اُس وقت سینئر آفیسر تھے گاؤں کے
گئے جہلم وہ بن کے نمائندے تھے گاؤں کے
ڈی۔سی جہلم اور فوجی کمان سے
توپ کی حاصل کپتان غلام محمد نے بڑی آن بان سے
پھر بھیجا گیا چکوال اسے ریل گاڑی پر
وہاں سے اسے لادا گیا بیل گاڑی پر
ہزاروں لوگوں نے رستے میں دیکھا اس انعام کو
اور داد دی کپتان صاحب کے اس خاص کام کو
لایا گیا اسے گاؤں میں بڑی آن بان سے
اور نصب کر دیا گیا اسے اِک نرالی شان سے
ملک بھر میں پہچان یہ توپ ہماری
آباء و اجداد کی شان یہ توپ ہماری
ایشیا میں توپ والا گاؤں دو المیال ہے
اعوان، بہادروں دلیروں کا گاؤں دوالمیال ہے
یہ دنیا بھر میں گاؤں کی پہچان بنی ہے
ولولہ جوش اور بہادری کی ہر جگہ شان بنی ہے
تاریخ ساز قوم کی پہچان یہ توپ ہماری
بڑھائے ریاضؔ ہم سب کی شان یہ توپ ہماری

..... ریاض ملک (دوالمیال).....

❁❁❁

انسانی پیدائش کا مقصد

انسانی پیدائش کے متعلق قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تا وہ خدا تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرے اور اس کا نمونہ بنے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۃ ذاریات آیت 57) میں نے جنّ وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے تا وہ خدا تعالیٰ کی صفات کا نقش اپنے دل پر پیدا کریں (جنّ سے اس جگہ انسان ہی کی بعض اقسام مراد ہیں نہ کہ کوئی غیر مرئی جنّ) اسی طرح قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۭ (سورۃ فاطر آیت:40) اے انسانو اللہ ہی ہے جس نے تم کو اس دنیا میں اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا ہے پس اگر کوئی شخص تم میں سے اس مقام کا انکار کرتا ہے تو اس کے انکار کا نتیجہ اسی کو پہنچے گا یعنی اس عزت کے مقام کو چھوڑ کر انسان خود ہی اپنا نقصان کرے گا۔ خدا تعالیٰ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کو دنیا میں ظاہر کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور وہ اس دنیا میں خدا تعالیٰ کا قائم مقام ہے۔ پس انسان نقطۂ مرکزی ہے تمام عالم مادی کے لئے۔ اور چونکہ انبیاء انسانوں کی اصلاح کے لئے اور ان کو اپنا فرض یاد دلانے کے لئے اور اسی میں کامیابی کے لئے صحیح طریق کار بتانے کے لئے آتے ہیں۔ اس لئے وہ نقطہ مرکزی ہیں تمام انسانوں کے لئے۔ یا یوں کہو کہ انسان ایک سورج کی طرح ہے جس کے گرد تمام مادی دنیا گھومتی ہے اور پھر اپنے اپنے دائرہ میں انبیاء ایک سورج ہیں جن کے گرد ان کے حلقہ کے انسان گھومتے ہیں۔

قانونِ قدرت اور قانونِ شریعت

قرآنِ شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلانے کے لئے اور ترقی کے راستہ پر اسے گامزن کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے دو قسم کے قانون جاری کئے ہیں۔ ایک قانونِ قدرت۔ اس کا تعلق انسان کی مادی ترقی کے ساتھ ہے چونکہ اس کا تعلق رُوح کے ساتھ براہِ راست نہیں۔ اس لئے اس قانون کے توڑنے پر اس کا نتیجہ نقصان کی صورت میں تو نکلتا ہے لیکن خدا تعالیٰ کی ناراضگی اور خفگی اس پر نہیں ہوتی۔ یہ قانون خدا تعالیٰ نے خود مادہ کے اندر ودیعت کر دیا ہے اس لئے کوئی بیرونی علم اس بارہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں آتا۔ دوسرا قانون، قانونِ شریعت ہے اس کا تعلق روحانی اصلاح کے ساتھ ہے اس قانون کے توڑنے پر خدا تعالیٰ کی ناراضگی ہوتی ہے کیونکہ اس قانون کے پورا کرنے سے ہی انسان اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اور اس قانون کو توڑنے کی وجہ سے وہ اس مقصد سے محروم رہ جاتا جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ پس جب کوئی شخص اس قانون کو توڑتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کو ناراض کر دیتا ہے لیکن ہر قانونِ شریعت کے توڑنے کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا کہ انسان کلی طور پر اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے بلکہ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ یہ تمام قانون مجموعی طور پر انسان کی روح کی پاکیزگی اور بلندی کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح قانونِ قدرت کے توڑنے سے ضروری نہیں کہ ہر قانون شکنی کی وجہ سے تباہی اور بربادی آجائے یا ہر بد پرہیزی کی وجہ سے ضرور بیماری پیدا ہو۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ قانونِ شریعت کا ہر حکم ٹوٹ جانے کی وجہ سے انسان اپنے مقصد سے بالکل محروم رہ جائے یا خدا تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہو جائے کیونکہ شریعت کے تمام احکام اصولی طور پر انسان کی درستی کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اور شریعت کا تمام نظام اسی مقصد کے لئے ہے۔ ایک وسیع نظام جو مختلف طریقوں سے ایک ہی غرض کے لئے اپنا اثر ڈال رہا ہے اگر اس کا کوئی حصہ اپنا کام کرنے سے عاری رہ جائے تو ضروری نہیں ہوتا کہ مقصود نتیجہ پیدا نہ ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس حصہ نے اپنے کام میں کوتاہی کی ہے دوسرے حصوں کا اثر اس کی کمزوری پر غالب آجائے اور مقصود نتیجہ پھر بھی پیدا ہو جائے انسان کا وجود ہی ایک مرکب وجود ہے۔ انسان کی زندگی، ہوا، پانی، غذا اور مختلف چیزوں پر انحصار رکھتی ہے بعض دفعہ ان ذرائع میں سے کسی میں کچھ نقص ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری چیزوں کے اثر کی وجہ سے وہ بیمار نہیں ہوتا۔ اسی طرح شریعت ہے کہ وہ ان احکام پر مشتمل ہے جو انسانی رُوح کی ترقی کے لئے ضروری ہیں اور ان کا مجموعی اثر انسان کی روحانی ترقی پر پڑتا ہے۔ پس جب تک خدا تعالیٰ کی حکومت یا اس کے انبیاء کی حکومت کے انکار کی روح نہ پیدا ہو جائے صرف غلطی یا کمزوری کی وجہ سے انسانی عمل میں اگر کوئی خامی رہ جائے تو ضروری نہیں کہ ایسی خامی انسان کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں ناکام کر دے۔ ہاں اگر خامی بہت بھی ہو تو سچی توبہ اور دعا بھی اس کا ازالہ کر سکتے ہیں اوپر کے قانونوں کے علاوہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دو اور قانون بھی ہیں ایک قانونِ تمدن اور دوسرا قانونِ اخلاق۔ یہ دونوں قانون درحقیقت قانونِ قدرت اور قانونِ شریعت کی سرحدیں ہیں۔ قانونِ اخلاق قانونِ شریعت کی طرف سرحد ہے اور قانونِ تمدن قانونِ قدرت کی طرف سرحد ہے اس لئے یہ دونوں

قانون بہت کچھ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ بہت سے تمدنی قانونوں کی بنیاد قانونِ اخلاق پر ہوتی ہے اور بہت سے اخلاقی قانونوں کی بنیاد قانونِ تمدن پر ہوتی ہے انسان چونکہ مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، اس لئے وہ ان دو قانونوں کا محتاج تھا۔ چونکہ قانونِ تمدن قانونِ قدرت سے ملتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کا اختیار زیادہ تر بنی نوع انسان کو دیا ہے اور چونکہ قانونِ اخلاق قانونِ شریعت سے ملتا ہے اس لئے قانونِ اخلاق کو قانونِ شریعت کے اندر داخل کیا گیا ہے گو اس کی بعض شقوں کو بنی نوع انسان کے سپرد بھی کر دیا گیا ہے۔ تمام دنیا کا نظام ان چاروں قانونوں سے چل رہا ہے۔ قانونِ قدرت میں بھی کسی کا دخل نہیں خدا ہی کی طرف سے وہ آتا ہے اور قانونِ شریعت میں بھی کسی انسان کا دخل نہیں وہ بھی خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتا ہے لیکن قانونِ تمدن اور قانونِ اخلاق میں خدا تعالیٰ اور انسانی نظام شریک ہو جاتے ہیں کچھ راہنمائی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور کچھ اختیار انسان کو دیا جاتا ہے اور اس طرح خدا اور بندے کے تعاون سے اس دنیا کے نظام کو بہتر سے بہتر بنایا جاتا ہے۔ جب تک یہ دو دریا متوازی چلتے رہتے ہیں اس وقت تک دنیا میں امن قائم رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت کے ساتھ مل کر انسان بھی دنیا میں ایک مفید اور بابرکت حکومت قائم کر لیتا ہے اور جب یہ دو دریا مختلف جہات کو چلنے شروع ہو جاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ انسانی عقل کی ندی اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنے رستہ سے بدل جاتی ہے اور خدائی راہنمائی کی ندی کے ساتھ ساتھ چلنے کی برکت سے محروم ہو جاتی ہے تو دنیا میں فساد اور جھگڑا اور لڑائی پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا پر نہ خدا کی بادشاہت رہتی ہے نہ انسان کی بلکہ شیطان کی بادشاہت قائم ہو جاتی ہے کیونکہ انسان خدا تعالیٰ کی ہدایت کے ساتھ ہی انسان بنتا ہے ورنہ وہ وحشی جانوروں میں سے ایک جانور کی طرح ہوتا ہے۔

انسان کو خدا تعالیٰ کا مقرب بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اسے صاحبِ اختیار بنایا جاتا۔ اس وجہ سے قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ انسان اس دنیا کے ایک حصہ میں مختار ہے اور ایک حصہ میں مقیّد ہے۔ وہ مقیّد ہے قانونِ قدرت کے معاملہ میں لیکن مختار ہے قانونِ شریعت کے معاملہ میں۔ قانونِ قدرت کے معاملہ میں وہ مقیّد ہے اس لئے کہ قانونِ قدرت پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ کوئی روحانی ترقی حاصل نہیں کرتا اور قانونِ شریعت میں اسے عمل کی آزادی دی گئی ہے اس لئے کہ قانونِ شریعت پر عمل کرنے سے وہ انعام کا مستحق ہوتا ہے اور انعام اسی صورت میں ملا کرتا ہے جبکہ آزادیٔ عمل حاصل ہو، جبری طور پر کرائے ہوئے کام کے بدلہ انعام نہیں ملا کرتا۔ قرآنِ شریف اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسان روحانی ترقی بھی اس کے جسمانی حالات سے متاثر ہوتی ہے اور جس حد تک وہ اس سے متاثر ہوتی ہے اس کے اعمال یقیناً محدود ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم اس کا جواب یہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ انسانی اعمال کی قیمت اس کے ماحول کو مدّنظر رکھتے ہوئے لگائے گا۔ مثلاً اگر ایک شخص لاکھوں روپے کا مالک ہو کر دنیا کی بہتری اور بھلائی کے لئے سو روپیہ خرچ کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص صرف چند روپوں کا مالک ہو کر دنیا کی بھلائی کے لئے اپنا سارا مال خرچ کر دیتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے دونوں کو ایک سا ثواب نہیں ملے گا۔ جس نے چند روپے خرچ کئے تھے گو اس کے روپے تھوڑے تھے مگر اسے ثواب زیادہ ملے گا کیونکہ اس کے ماحول کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ لیکن جس نے لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کے ہوتے ہوئے ایک سو روپیہ کی مدد کی اس کے ماحول مدّنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس نے اپنی طاقت کا ہزاروں یا لاکھواں حصہ خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا۔ پس خدا تعالیٰ عمل کی مقدار کو نہیں دیکھتا بلکہ اس ماحول کو دیکھ کر عمل کی قیمت لگاتا ہے جس ماحول میں کوئی انسان کام کرتا ہے اور وہ ان مجبوریوں یا ان سہولتوں کو نظر انداز نہیں کرتا جن کے ماتحت کام کرنے والے کے عمل میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی یا جن کی مدد سے کام کرنے والے کو کام میں سہولت حاصل ہوئی۔

قرآن میں ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جسمانی دنیا نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے اسی طرح روحانی دنیا کے لئے بھی آہستہ آہستہ ترقی مقدر تھی اسی لئے خدا تعالیٰ کا کامل کلام دنیا کے شروع میں نہیں آیا۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا اسے اس کی ترقی کے درجہ کے مطابق شریعت دی گئی آخر ہوتے ہوتے انسان اس مقام پر پہنچ گیا جبکہ وہ کامل ترین شریعت کا حامل ہو سکتا تھا اس وقت خدا تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت دنیا کا کامل ترین وجود ظاہر ہوا اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے پس آپ ﷺ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی شریعتوں میں سے کامل ترین شریعت اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کتابوں میں سے کامل ترین کتاب نازل ہوئی، جس طرح مادی عالم کا نقطۂ مرکزی انسان ہے جس طرح مختلف زمانوں اور قوموں کے لئے ان کا نقطۂ مرکزی اس کے انبیاء ہیں۔ اسی طرح کہ تمام مادی عالم کا پہلا نقطۂ مرکزی انسان ہے یہ انسان مختلف دائروں میں اپنے اپنے زمانہ کے نبیوں کے گرد گھومتے ہیں۔ تمام نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد گھومتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے گرد گھومتے ہیں اس طرح یہ روحانی دنیا مکمل ہو جاتی ہے۔

(دیباچہ تفسیر القرآن صفحہ 315 تا 319)

کبھی کوئی شخص جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے تھیں تو تاریخ سے ہمیں ایسے لوگوں کی مثالیں نظر آنی چاہئیں جو بزور مسلمان بنائے گئے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ہزاروں مسلمانوں اور کافروں کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں کوئی ایک مثال تو ایسے شخص کی ملنی چاہئے جسے تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی جبری تبلیغ کی نظر نہیں آتی۔ ہاں دوسری طرف ایسی مثالیں تاریخ سے ثابت ہیں کہ عین لڑائی کے دوران میں کسی مشرک نے اسلام کا اظہار کیا، لیکن مسلمانوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص ڈر کر اسلام کا اعلان کر رہا ہے اور اس کے اسلام کے اظہار کے ساتھ دل کی تصدیق شامل نہیں ہے اس کے اسلام کو اسلام نہیں سمجھا اور اسے تلوار کی گھاٹ اُتار دیا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک لڑائی کے دوران میں کسی مشرک نے اسلام کا اظہار کیا، لیکن مسلمانوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص ڈر کر اسلام کا اعلان کر رہا ہے اور اس کے اسلام کے اظہار کے ساتھ دل کی تصدیق شامل نہیں ہے اس کے اسلام کو اسلام نہیں سمجھا اور اسے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا؛ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک لڑائی میں اسامہ بن زید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے صاحبزادے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھے ایک کافر کے سامنے ہوئے جب اس کافر نے دیکھا کہ اسامہ نے اس پر غلبہ پالیا ہے تو کہنے لگا میں مسلمان ہوتا ہوں، لیکن اسامہ نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنا نیزہ چلا دیا۔ جب لڑائی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس واقعہ کا ذکر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسامہ پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ جب وہ شخص اسلام کا اظہار کرتا تھا تو تم نے اسے کیوں مارا؟ اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ ڈر کے مارے ایسا کہتا تھا اور دل میں مسلمان نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا لیا تھا؟'' یعنی بالکل ممکن ہے کہ اسی وقت اس پر اسلام کی صداقت کھل گئی ہو اور وہ دل سے مسلمان ہو گیا ہو۔ مثلاً ایسا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کا یہ معیار رکھا ہو کہ اگر میں لڑائی میں غالب ہو گیا تو ثابت ہوگا کہ خدا ایک ہے۔ بہر حال اس کا میدانِ جنگ میں مسلمان ہونا اس بات کا یقینی ثبوت نہیں تھا کہ وہ ڈر کر مسلمان ہوتا ہے۔ پس جب اس بات کا امکان تھا کہ وہ دل سے مسلمان ہوتا ہے تو اسامہ کو اپنا ہاتھ روک لینا چاہئے تھا اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر ناراض ہوئے اور اسامہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر اس قدر ناراض ہوئے کہ میں نے یہ تمنا کی کہ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا اور اب اس کے بعد مسلمان ہوتا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ناراضگی میرے حصہ میں نہ آتی۔ (مسلم کتاب الایمان)

پھر تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اگر کسی وجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی شخص کے متعلق یہ علم ہو گیا ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوا بلکہ محض ڈر یا طمع کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اسلام قبول نہیں فرمایا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ایک روایت آتی ہے کہ کسی لڑائی میں صحابہ نے ایک ایسے کافر کو قید کیا جو بنو ثقیف کے حلیفوں میں سے تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قیدی کے پاس سے گزرے تو اس نے قید سے رہائی پانے کے خیال سے کہا کہ ''اے محمد مجھے کیوں قید میں رکھا جاتا ہے میں تو مسلمان ہوتا ہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم اس حالت سے پہلے اسلام لاتے تو خدا کے حضور یہ اسلام مقبول ہوتا اور تم نجات پا جاتے مگر اب نہیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کے بدلے میں دو مسلمان قیدی بنو ثقیف سے چھڑوا لئے اور اسے کفار کو واپس کر دیا۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب حکم الاسراء) الغرض تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ صحابہ نے کسی شخص کو تلوار سے ڈرا کر مسلمان بنایا ہو بلکہ جو مثال ملتی ہے اس کے خلاف ملتی ہے اور یہ اس بات کا ایک عملی ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے نہ تھیں۔

اس جگہ اگر یہ شُبہ پیدا ہو کہ لڑائی میں کسی کافر کی طرف سے اسلام کے اظہار پر اسے چھوڑ دینا یہ بھی تو ایک رنگ کا جبر ہے تو یہ ایک جہالت کا اعتراض ہوگا۔ وجہ مخاصمت دور ہو جانے پر لڑائی سے ہاتھ کھینچ لینا حسن اخلاق اور احسان ہے نہ کہ جبر و ظلم۔ کفار عرب کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ کرنا صرف اس بناء پر تھا کہ انہوں نے آپ کے خلاف تلوار اٹھائی تھی اور اسلام کی پر امن تبلیغ کو بزور روکنا چاہتے تھے اور اس کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ملک میں امن اور مذہبی آزادی قائم کرنا چاہتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمان ہو جاتا ہے تو قطع نظر اس کے کہ اسے گھر میں بیٹھے ہوئے اسلام پر شرح صدر پیدا ہوتا ہے یا میدان جنگ میں۔ جب بھی وہ اسلام کا اظہار کرے گا تو اس کے اس اظہار کے کم از کم یہ معنے ضرور ہوں گے کہ اب اس کی طرف سے وہ خطرہ دور ہو گیا ہے جن کی بناء پر یہ جنگ ہو رہی تھی تو اس صورت میں لازماً اس

کے خلاف کارروائی بند کر دی جاوے گی۔ درحقیقت جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا جنگ کی ابتداء تو کفار کی طرف سے تھی۔ پس جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو طبعاً اس کے یہ معنے ہوتے تھے کہ اب وہ جنگ کو ترک کر کے حل کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پس اس کے خلاف لڑائی روک دی جاتی تھی۔ یہی مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ۔ (مسلم کتاب الایمان) یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کفار سے جنگ کروں جو اسلام کے خلاف میدان جنگ میں نکلے ہیں سوائے اس کے کہ وہ مسلمان ہو جائیں، مگر غلطی سے بعض لوگوں نے اس حدیث کے معنے یہ سمجھ لئے ہیں کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے تمام کافروں کے خلاف اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ حالانکہ یہ معنے قرآنی تعلیم اور تاریخی واقعات کے صریح خلاف ہیں اور یہ ایک سراسر خلاف دیانت فعل ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کے وہ معنے چھوڑ کر جو قرآن و تاریخ کے مطابق ہیں اور لغت عرب کی رو سے بھی ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا وہ معنے کئے جاویں جو واضح قرآنی تعلیم اور صریح تاریخی واقعات کے بالکل خلاف ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا یہی مطلب ہے کہ جن کفار نے مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھائی ہے اور ملک میں نقضِ امن کا موجب ہو رہے ہیں مجھے ان کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اگر وہ مسلمان ہو جائیں اور ان کی طرف سے یہ خطرہ جاتا رہے تو مجھے لڑائی بند کر دینے کا حکم ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ مجھے ان کفار کے خلاف اس وقت تک لڑنے کا حکم ہے کہ یا تو جنگ کا طبی نتیجہ ظاہر ہو جاوے لیکن یہ لوگ جو اسلام کے خلاف اُٹھے ہوئے ہیں مفتوح ہو جائیں اور جنگ کا خاتمہ ہو جاوے اور یا وہ اسلام کی صداقت کے قائل ہو کر مسلمان ہو جائیں اور ان کی طرف سے امن شکنی کا کوئی اندیشہ نہ ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ صرف اسلام کے اظہار پر ہی لڑائی بند نہیں ہوتی تھی بلکہ اگر کوئی قبیلہ مسلمانوں کے خلاف جنگ ترک کر دیتا تھا اور مسلمانوں کی سیاسی حکومت کو قبول کر لیتا تھا تو خواہ وہ کفر و شرک پر بھی قائم رہتا تھا اس کے خلاف بھی جنگ کی کارروائی روک دی جاتی تھی۔ چنانچہ اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں مذکور ہیں جو اپنے موقع پر بیان ہوں گی۔ الغرض اسلام کے اظہار پر لڑائی بند کر دینے کے علم کا قطعاً کوئی تعلق جبر سے نہیں ہے بلکہ یہ ایک حسنِ سیاست کا فعل ہے جو ہر عقل مند کے نزدیک قابل تعریف سمجھا جانا چاہئے۔ یہ تشریح جو اس حدیث بیان کی گئی ہے یہ محض عقلی تشریح نہیں بلکہ خود قرآن کریم کمال صراحت کے ساتھ اس تعلیم کو پیش کرتا ہے کہ اگر کفار اپنے مظالم سے باز آ جائیں اور ملک میں فساد اور امن شکنی کا موجب نہ بنیں تو اس صورت میں مسلمانوں کو ان کے خلاف فوراً کارروائی روک دینی چاہئے۔ چنانچہ قرآن شریف فرماتا ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ۔

یعنی اے مسلمانو! تم جنگ کرو ان کفار سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اس وقت تک کہ ملک میں فتنہ نہ رہے اور ہر شخص اپنے خدا کے لئے نہ کسی ڈر اور تشدد کی وجہ سے) جو دین بھی چاہے رکھ سکے اور اگر یہ کفار اپنے غلاموں سے باز آ جائیں تو تم بھی رُک جاؤ کیونکہ تمہیں ظالموں کے سوا کسی کے خلاف جنگی کارروائی کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس آیت کی تفسیر حدیث میں اس طرح آتی ہے کہ

ترجمہ:

''یعنی یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لڑو ان کفار سے جو تم سے لڑتے ہیں اس وقت تک کہ ملک میں فتنہ نہ رہے اس کے متعلق ابن عمر کہتے ہیں کہ ہم نے اس الٰہی حکم کی تعمیل یوں کی کہ جبکہ رسول اللہ کے زمانہ میں مسلمان بہت تھوڑے تھے اور جو شخص اسلام لاتا تھا اسے کفار کی طرف سے دین کے راستے میں رکھ دیا جاتا تھا اور بعض کو قتل کر دیا جاتا تھا اور بعض کو قید کر دیا جاتا تھا۔ پس ہم نے جنگ کیا اس وقت تک کہ مسلمانوں کی تعداد اور طاقت زیادہ ہو گئی اور نو مسلموں کے لئے فتنہ نہ رہا۔''

اس واضح اور بیّن آیت اور اس واضح اور بیّن حدیث کے ہوتے ہوئے ذو معنیین حدیث سے جبری اشاعت کی تعلیم ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہرگز دیانت داری کا فعل نہیں سمجھا جا سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لڑائیاں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی غرض سے نہ تھیں یہ ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ صلح کے خواہشمند رہتے تھے۔ اور آپ ﷺ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح یہ لڑائیاں بند ہو جاویں اور ملک میں امن و امان کی صورت پیدا ہو۔ دیکھیں حدیبیہ میں کوئی کُشت و خون نہیں ہوا اور بظاہر مسلمانوں کو دب کر صلح کرنی پڑی۔ لیکن ان کے جہاد کا مقصد حاصل ہو گیا یعنی جنگ رُک گئی اور ملک میں امن قائم ہو گیا پس حقیقی فتح صلح حدیبیہ ہی تھی اور اسی لئے خدا تعالیٰ نے اس کا نام فتح مبین رکھا اور یہ ایک نہایت زبردست ثبوت اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کی لڑائیاں دفاع یا قیامِ امن کے لئے تھیں نہ کہ اسلام کو بزور پھیلانے کی غرض سے۔

(سیرت خاتم النبیین صفحہ 291 تا 294)

ہر نسل اک فصل ہے دھرتی کی، آج اُگتی ہے کل کٹتی ہے

تحریر: صہیب مرغوب

ساحر لدھیانوی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ہر دور کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کہتے تھے مسلم کش فسادات سے انڈیا میں علم و ادب کی تمام شمعیں بجھنے لگیں۔ انڈیا میں وہ تمام قدریں خطرے میں پڑ گئیں جن سے ادب، آرٹ اور تہذیب کے سرچشمے پھوٹتے تھے۔ ساحر کی عمر 6 ماہ تھی کہ والدین میں علیحدگی ہوگئی، جاگیردار باپ ساحر کو حاصل کرنے کا ہر مقدمہ ہار گیا۔

ساحر لدھیانوی (8 مارچ 1921ء تا 25 اکتوبر 1980ئ) کو کریم پورہ (لدھیانہ) کی ''سرخ سینڈسٹوں حویلی'' میں پیدا ہوئے۔ نام عبدالحئی فضل محمد رکھا گیا مگر قسمت میں شہرت ''ساحر لدھیانوی'' کے نام سے لکھی تھی۔ شائد یہ سرخ حویلی میں پیدائش کا ہی اثر تھا کہ ان کی شاعری پر ہمیشہ ترقی پسندی کی چھاپ رہی۔ ساحر 6 ماہ کے تھے کہ جاگیردار باپ اور ماں میں ان بن ہوگئی، دونوں الگ ہوگئے ،باپ، بیٹے ساحر کو حاصل کرنے کا ہر مقدمہ ہار گیا۔ خلع لیا تھا، ماں کو نان ونفقہ سے محروم ہونا پڑا۔ مالی تنگی اور ماں کا ہر دکھ ساحر کے سینے میں کسی قہر کی طرح پنپتا رہا۔ اس وراثت سے ساحر زندگی بھر دامن نہ چھڑا سکے۔ سریندر دوئل نے اپنی کتاب ''ساحر۔ ایک ادبی خاکہ'' میں زندگی کا نچوڑ یوں بیان کیا ہے، ''بقول احمد راہی، ساحر نے زندگی میں ٹوٹ کر محبت بھی کی اور کھل کر نفرت بھی۔ انمٹ محبت انہیں اپنی ماں سے تھی اور واحد نفرت کا نشانہ باپ تھے''۔ ساحر کہتے ہیں،

میں نے چاند ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا
میں وہ نغمہ ہوں جسے پیار کی محفل نہ ملی
وہ مسافر ہوں جسے کوئی بھی منزل نہ ملی
دل میں ناکام امیدوں کے بسیرے پائے
روشنی لینے کو نکلا تو اندھیرے پائے

1943ء میں ساحر نے لاہور کو مسکن بنا لیا جہاں وہ دیال سنگھ کالج میں طلباء یونین کے صدر بن گئے۔ بڑے ہوئے تو شہرہ آفاق جرائد کی ادارت سنبھال لی۔ ''ادب لطیف''، ''شاہکار'' اور ''سویرا'' انہی کے لگائے ہوئے پودے ہیں، یہ اب بڑا ادبی حوالہ بن چکے ہیں۔ لاہور میں قیام کے دو سال کے اندر اندر انہوں نے زمانے کے حوادث کو آشکارا کرنے والی شاعری پر مشتمل اپنا پہلا مجموعہ کلام ''تلخیاں'' مکمل کیا۔ فیض احمد فیض کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' کی بحر میں لکھی گئی مشہور زمانہ نظم ''آواز آدم'' بھی انہوں نے یہیں شائع کی جس کی گونج سرکاری ایوانوں میں بھی سنی گئی۔ کہتے ہیں،

دبے گی کب تک آواز آدم، ہم بھی دیکھیں گے
رہیں گے کب تلک جذبات برہم بھی دیکھیں گے
چلو یونہی سہی یہ جور پیہم، ہم بھی دیکھیں گے
دار زنداں سے دیکھیں یا عروج دار سے دیکھیں
تمہیں رسوا سر بازار عالم ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو مآل شوکت جم، ہم بھی دیکھیں گے

1949ء میں وہ لاہور سے واپس بمبئی چلے گئے جہاں ''اندھیری'' قصبے کی اندھیر زندگی کو منتظر پایا۔ ساحر پھر اسی ''اندھیری'' کے ہو رہے۔ یہیں کوٹھی بنائی، آخری سانس بھی اسی کوٹھی میں لی۔ کوٹھی کا نام اپنے مجموعہ کلام ''پرچھائیاں'' کے نام پر رکھا۔ یہ ''پرچھائیاں'' آج بھی اہل محلہ کو ساحر کی یاد دلاتی ہے۔ کرشن چندر اور شاعر گلزار بھی یہیں ان کے ہمسائے بنے۔ چند ہی برسوں میں ہر جگہ ''ساحر ساحر'' ہو رہا تھا، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کا ہی نام گونج رہا تھا۔ مجموعہ کلام ہاتھوں ہاتھ بک گیا، بڑے بڑے انعامات پانے کے بعد ان کی کیفیت کچھ یوں تھی،

میں پل دو پل کا شاعر ہوں، پل دو پل مری کہانی ہے
پل دو پل مری ہستی ہے، پل دو پل مری جوانی ہے
مجھ سے پہلے کتنے شاعر آئے اور آ کر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے، کچھ نغمے گا کر چلے گئے
وہ بھی اک پل کا قصہ تھے، میں بھی اک پل کا قصہ ہوں
کل تم سے جدا ہو جاؤں گا، گو آج تمہارا حصہ ہوں
پل دو پل میں کچھ کہہ پایا، اتنی ہی سعادت کافی ہے
پل دو پل تم نے مجھ کو سنا، اتنی ہی عنایت کافی ہے
کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے

ہر نسل اک فصل ہے دھرتی کی، آج اگتی ہے کل کٹتی ہے

ان کی ساحرانہ شاعری حیران کر دینے والی تھی، وہ برصغیر کے ترقی پسند شعراء کی صف میں کم عمر بھی تھے اور نمایاں بھی، جذبات کی شدت ان کی شاعری کی پہچان ہے لیکن جذبات میں آ کر وہ تخت الٹانے اور محلات کو گرانے کی بات نہیں کرتے۔ دھیما لہجہ شناخت ہے، وہ تو اپنے اندر کی دنیا میں گم رہ کر باہر کی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، دنیاوی معیارات سے تنگ بلکہ باغی تھے۔

وہ کبھی کبھار دنیا سے اس قدر مایوس ہو جاتے ہیں کہ کچھ بھی مل جانے کی خوشی سے ماوراء نظر آتے ہیں، کیونکہ چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی روگ کے ساتھ جی رہا ہے، پوری دنیا کا یہی چلن ہے۔ کہتے ہیں،

ہر اک جسم گھائل ہر اک روح پیاسی
نگاہوں میں الجھن دلوں میں اداسی
یہ دنیا ہے یا عالم بد حواسی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے
یہاں اک کھلونا ہے انسان کی ہستی
یہ بستی ہے مردہ پرستوں کی بستی
یہاں پر تو جیون سے ہے موت سستی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

''تلخیاں'' کا تیسرا ایڈیشن زیر طبع تھا کہ انڈیا میں مسلم کش فسادات شروع ہو گئے۔ خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، شاعری کی فکر کس کو تھی۔ جس سے انڈیا میں نہ صرف اس ایک مجموعہ کلام کی اشاعت متاثر ہوئی بلکہ علم و ادب کی تمام شمعیں ایک ایک کر کے بجھنے لگیں۔ دہلی، ممبئی اور کئی علاقوں میں ادبی اداروں کو بھی تالے لگ گئے۔ ساحر خود کہتے ہیں، ''اس سے وہ تمام قدریں خطرے میں پڑ گئیں جن سے ادب، آرٹ اور تہذیب کے سرچشمے پھوٹتے تھے۔ حالات ادب اور ادیب، دونوں کے لئے مخدوش ہیں۔ کوئی دوسری کتاب آپ تک اسی وقت پہنچ سکے گی جب ترقی اور انقلاب کی طاقتیں رجعت پسند طاقتوں پر اس حد تک قابو پا لیں گی کہ موجودہ کشت و خون کا ہنگامہ رک جائے اور تہذیبی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے کے امکانات فراہم ہوں۔

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنے قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

ان کے نزدیک زندگی سے بڑی حقیقت کوئی نہیں، اس میں خوابوں کی کوئی حیثیت ہے نہ خوابوں میں رہنے والوں کا کوئی مقام، وہ کہتے ہیں... کام، کام اور کام۔ ان کی شاعری میں خوابوں میں جینے والی قوموں کے لئے محکومی کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ نظم ''شہزادے'' پڑھ لیجئے،

ذہن میں اجداد کے قصے لے کر
اپنے تاریک گھروندوں کے خلاء میں کھو جاؤ
مرمریں خوابوں کی پریوں سے لپٹ کر سو جاؤ
ابر پارو پہ چلو، چاند ستاروں پہ اڑو

لہٰذا یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اشعار کے بارے میں ان کا نکتہ نظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ ایک ایک شعر کے فنی لوازمات اور جمالیاتی پہلو کے قائل ہیں لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کا مخاطب پڑھا لکھا، امیر طبقہ ہی نہیں ہے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں سے بھی مخاطب ہیں۔ اگر ہر شعبہ ہائے زندگی میں ابلاغ نہیں ہوگا تو ان کا پیغام کیسے گھر گھر پہنچے گا یہی نکتہ نظر عام فہم شاعری کی بنیاد بنا۔ وہ کہتے تھے۔ ''سماج کے اس طبقے کو حکمران جماعتوں نے علم، آرٹ اور ادب کے سرچشموں سے بہت دور کر رکھا ہے۔ اس طبقے تک پہنچنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی بات سادہ زبان میں کہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس صورت میں فن کار کو اپنی روایتی بلندی سے نیچے اتر کر آنا پڑے گا، لیکن موجودہ سماجی حالت میں یہ ضروری ہے''۔ وہ کتنی بڑی بات سادہ سے لہجے میں کہہ جاتے ہیں، جیسا کہ یہ پیغام،

اے رہبر ملک و قوم ذرا
آنکھیں تو اٹھا نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
دھرتی کی سلگتی چھاتی کے بے چین شرارے پوچھتے ہیں
تم لوگ جنہیں اپنا نہ سکے، وہ خون کے دھارے پوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چلاتی ہے، ساگر کے کنارے پوچھتے ہیں
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟
اے رہبر ملک و قوم ذرا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟

اس نظم میں ان کا مخاطب انگریز ہیں، جنہوں نے 1946ء میں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ علامہ اقبالؒ کی طرح وہ بھی بڑی طاقتوں کے جبر سے نالاں تھے۔ کہتے ہیں،

تم ہی تجویز صلح لاتے ہو
تم ہی سامان جنگ بانٹتے ہو
تم ہی کرتے ہو قتل کا ماتم
تم ہی تیر و تفنگ بانٹتے ہو

شہید افگار بخاری

تحریر: محمد حسین ہنرمل

" پچھلے دو تین سال ضلع لکی مروت اور بنوں کے ادب کے لئے مسلسل عام الحزن ثابت ہو رہے ہیں۔ تین برس قبل پروفیسر رحمت اللہ درد چل بسے جن کی رحلت سے پشتو غزل کے میدان میں ایک نہ پر ہونے والا خلاء پیدا ہوا۔ پھر گزشتہ سال ضلع لکی مروت ہی سے تعلق رکھنے والا ایک اور درویش صفت شاعر عمر دراز مروت طویل علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم عمر دراز بھی یاروں کے یار اور ہر دلعزیز شاعر تھے۔

رواں سال چند ہفتے پہلے ضلع بنوں کے بزرگ اور خوش آواز شاعر اور ادیب غازی سیال کی ارتحال کی خبر آئی جس کی موت نے بھی ادبی حلقوں کو خاصا سوگوار کر دیا۔ چار روز پہلے رات کو پھر لکی مروت کے ایک اور خوش خلق اور نامور شاعر سید ظہور شاہ المعروف افگار بخاری کی شہادت کی روح فرسا خبر سوشل میڈیا پر چل پڑی۔

افگار بخاری چونکہ مسلک کے اعتبار سے سنی نہیں تھے یوں غالب گمان یہی ہے کہ مرحوم فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے ظالموں کی گولی کا نشانہ بن چکے ہوں گے۔ لکی مروت کے اس منکسر المزاج اور محفلوں کی روح کو گرمانے والے شاعر اس سے پہلے بھی فرقہ پرستوں کے قاتلانہ حملوں کی زد میں آئے تھے تاہم اس مرتبہ قاتلوں نے ان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شہید افگار بخاری اگرچہ شیعہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شیعوں سے زیادہ سنی المسلک لوگوں میں زیادہ محبوب اور مقبول تھے۔ افگار نے اپنے آپ کو فرقہ پرستی کی لعنت سے اس حد تک مبرا کیا ہوا تھا کہ ان کے جنازے میں نہ صرف بے شمار سنی العقیدہ لوگوں کی ایک جم غفیر شریک ہوئی بلکہ ان کی نماز جنازہ بھی ایک سنی عالمِ دین مولوی حافظ امان اللہ خان نے پڑھائی۔

افگار بخاری نے 1962 کو لکی مروت کے ایک معزز پشتون خاندان میں آنکھ کھولی، آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے کہ انہوں نے شعر کا ملکہ حاصل کر لیا۔ پہلے اردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا جبکہ بعد میں کلاچی کے ممتاز شاعر مرحوم طاہر کلاچوی کی شاعری سے متاثر ہونے کے بعد انہوں نے خود بھی پشتو زبان میں شعر کہنے اور لکھنے کا آغاز کیا۔ ان کی شاعری پر عوامی رنگ اگرچہ زیادہ غالب تھی لیکن کمال کی غزل لکھتے تھے۔ ظلم و بربریت سے نفرت اور امن و بھائی چارے کا پرچار شہید افگار بخاری کی شاعری کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ سردار علی ٹکر اور استاد خیال محمد جیسے معروف پشتو موسیقاروں کے علاوہ بے شمار دیگر موسیقاروں نے ان کی غزلیں اور گیت گائے۔ چند سال پہلے اپنی ایک انٹرویو میں افگار بخاری نے کہا تھا کہ وہ مختلف شعری اصناف یعنی غزل، نظم، مثنوی، رباعی اور فوک لور میں اتنی زیادہ شاعری تخلیق کر چکا ہے کہ اس سے کئی مجموعے بن سکتے ہیں لیکن موسیقی کے ساتھ زیادہ تعلق کی بنا پر وہ ابھی تک اپنی شاعری کو کتابی شکل نہیں دے پایا ہے۔ افگار بخاری کی شہادت سے پشتو ادب میں مزید خلا پیدا ہوا جو کہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم بخاری کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی پسماندہ فیملی کو صبر و تحمل عطا کرے۔ اس مختصر کالم کے آخر میں اپنے قارئین کے لئے شہید افگار بخاری کی ایک مشہور پشتو غزل اردو ترجمے کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں،

لا می چی زڑگی تہ را نزدے نہ وے
لا مو چی تر منزہ فاصلے نہ وے
مابہ درنہ سر صدقہ کڑے وے
تاتہ کہ پیغور د زمانے نہ وے
ولی بہ افگار داسے مڑہ مڑہ ژڑل
شکلے کہ دے سترگے داسے مڑے نہ وے

ترجمہ: کاش! تم یا تو میرے دل میں بسیرا نہ کرتے یا پھر ہمارے بیچ اتنے فاصلے نہ ہوتے۔

تم پر اپنی جان فدا کر دینا میرے لئے بڑا آسان ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ پھر تم زمانے کے طعنوں سے کیسے نجات پاؤ گے؟

افگار بخاری سرنگوں حالت میں ایسے آٹھ آٹھ آنسو نہ بہاتے اگر تیری خوبصورت آنکھیں ایسی خوابیدہ نہ ہوتیں۔

ایک اور غزل میں کیا خوب منظر کشی کر چکے ہیں،

ھغے تہ ووایہ چی یو زل دی پہ بام و خیزی
پہ زکندن یمہ چی ساہ می پہ ارام و خیزی
افگار چی کلہ ستا پہ پل سجدہ د مینے وکڑی
دستڑی ژوند ستڑی سفرئے پہ یو گام و خیزی۔

ترجمہ: اسے کہہ دو کہ ایک مرتبہ اپنے گھر کی چھت پر چڑھ جائیں تاکہ انہیں دیکھ کر میری روح سہولت سے پرواز کرے۔

افگار جب تیرے قدموں کے نشانات کے اوپر محبت کا سجدہ کر لیتا ہے تو ان کی پوری زندگی کی تھکاوٹ ایک لمحے میں نکل جاتی ہے۔

عورتوں سے باتیں کرنا

تحریر: محمد اسلم

محمد اسلامیہ صدیوں پرانی بات ہے مگر بات سچ ہے اور رسوائی کی بھی نہیں ہے۔ جب برصغیر میں عورت کی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی، محلے، اسکول، کالج، مارکیٹس اور دیگر مقامات پر عورت معدوم ہوتی تھی اور خواتین عموماً گھروں میں رہنا پسند کرتی تھی۔ البتہ جب انہیں مجبوراً گھر سے باہر قدم رکھنا پڑتا تھا تو پردے کا اہتمام اس طرح کیا جاتا تھا جس طرح آج کل کسی اہم شخصیت کے لئے سکیورٹی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں عورت کا دیدار اور اس سے بات چیت کرنے کا معاملہ ایسا ہی مشکل تھا جیسے پاکستان کو قرضوں سے بے باق کرنا مشکل ہے۔ اس زمانے میں رفعت القاسمی کی طرح کوئی صاحب یہ شعر کہہ بھی نہیں سکتے کہ بغیر اس کے بھی دن گزریں گے اپنے یہ اک لمحے کو بھی سوچا نہیں تھا کیوں کہ اس زمانے میں یہ جنس نایاب تھی، ہاں البتہ کبھی کبھی خوش قسمتی سے کوئی صاحب، کسی خاتون کی زلف، دست حنا، ٹخنا، پیر، دوپٹے کا لہرانا اور اچانک ادھر سے ادھر ہوتے ہوئے کسی کا سراپا دیکھ لیتے تو برسوں سرد آہیں بھرتے رہتے تھے۔ راتیں ہجر میں گزارتے تھے۔ ان مناظر کا تصور کر کے دل ویراں کا ماتم کرتے تھے، مگر صاحب دیدار اور بات چیت نصیب میں کہاں ہوتی تھی۔ یہ ہیں وہ حالات جنہوں نے شعرا کو غزل کی تخلیق پر مجبور کیا۔ بالفاظ دیگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ غزل کہہ کر اس دور میں اپنی ٹھرک پوری کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا، وہ باتیں جو عورتوں سے نہیں کی جاسکتی تھیں، وہ غزل میں کہی جانے لگیں اور غزل کی تعریف بھی یہی کی گئی کہ ''عورتوں سے باتیں کرنا'' اگر غزل کا مطلب یہی ہے تو نظم میں کس سے بات کی جاسکتی ہے۔ یہ بات میرے لئے ناقابل فہم ہے کہ اگر کوئی گونگا شاعر غزل کہے تو وہ عورتوں سے کس طرح باتیں کرے گا۔ اسے تہذیب کہئے یا شائستگی یا پھر بزدلی، اس عہد میں شعراء نے غزل میں محبوب کو مذکر کی حیثیت سے مخاطب کیا ہے۔ غالباً وہ مونث کی حیثیت سے مخاطب کرتے تو فسادات پھوٹنے یا راز فاش ہونے کا خدشہ تھا۔ اور اب جو عصر حاضر میں فیس بک پر ہمیں ایسی غزلیں دکھائی دے رہی ہیں جن میں وزن اور بحر کا خیال نہیں رکھا تو ایسی غزلوں کی تعریف قطعی یہ نہیں کہ عورتوں سے باتیں کرنا۔ حکیم شرارتی نے اس کی تعریف یہ کی ہے۔ ''خواجہ سراؤں سے باتیں کرنا'' دراصل حکیم صاحب کا خیال ہے کہ شعر اور عورت کا وزن اگر درست ہو تو تب ہی دونوں اچھے لگتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ بھی اس خیال سے اتفاق کریں۔ سردست، میں ایک سوال بھی آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب خواتین غزل کہتی ہیں تو وہ کس سے باتیں کرتی ہیں؟۔ اگر وہ مردوں سے باتیں کرتی ہیں تو یہ بری بات ہے اور اگر وہ عورتوں سے باتیں کرتی ہیں تو یہ انتہائی بری بات ہے۔ یوں بھی عورتیں آپس میں بات چیت کرتی رہی ہیں لیکن وہ کیا باتیں کرتی ہیں، یہ ہم نہیں بتائیں گے بلکہ آپ خود تصور کر لیں، بہرکیف جناب بات ہو رہی تھی غزل کی ابتدا کی تو غزل کا معاملہ ایسا ہی ہے کہ، وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ بالفاظ دیگر لوگ غزل سے شناسا ہوتے گئے اور یہ مقبول ہوتی گئی۔ ہمارے شعراء نے ابتدا سے ہی غزل کی خوب پذیرائی کی۔ بالکل پروین شاکر کے اس شعر کی طرح۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی غ

زل ایک خوبصورت اور انتہائی مقبول صنف ہے۔ یہ چار سو برس سے زائد عرصے سے کہی جارہی ہے لیکن بوڑھی نہیں ہوئی۔ آج بھی حسین ہے، پرکشش ہے، توانا ہے اور ہر شاعر اس کی آبیاری کر کے فخر محسوس کرتا ہے۔ اب ساری دنیا جانتی ہے کہ اردو غزل کسے کہتے ہیں، بقول احمد ندیم قاسمی۔

''ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے۔''

آپ غزل کو اردو شاعری کا شاہکار قرار دے سکتے ہیں، احمد ندیم قاسمی کا ہی شعر ہے۔

جس بھی فنکار کا شاہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا

غزل معدوم نہیں ہوئی، شکست و ریخت کا شکار نہیں ہوئی، صدی پر صدی گزرتی گئی اور غزل کی توانائی میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ آج بھی جوان ہے اور خاص و عام میں مقبول ہے۔ اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں، غزل بہت پیاری شے ہے یا مجھے غزل سے محبت ہے لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ میں کسی ذکیہ، رابعہ اور غزل کی بات نہیں کر رہا ہوں، یہ غزل تو ایک موسیقارانہ اور سریلا خیال ہے، جس میں عورتوں سے باتیں کی جاتی ہیں، اس حوالے سے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ''ایک خان صاحب کا لڑکا شاعر تھا، اور غزل لکھی کہتا تھا، یہ سلسلہ کافی عرصے سے جاری تھا، ایک دن وہ خان صاحب گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے اپنے صاحب زادے کے کمرے میں گئے۔ انہوں نے اسے خوب مارا پیٹا، چیخ و پکار پر خان صاحب کی اہلیہ بھاگی بھاگی آئیں اور استفسار کیا، معاملہ کیا ہے؟ خان صاحب نے بتایا کہ ''ان کے دوست نے انہیں آج غزل کا مطلب سمجھایا ہے

، میں سمجھتا تھا یہ دن بھر پڑھتا لکھتا رہتا ہے، مگر یہ تو سارا دن عورتوں سے باتیں کرتا ہے۔'' دیکھئے جناب، بعض غزلیں خوبصورت اور رومانوی نوعیت کی ہوتی ہیں لہٰذا بندہ خوبصورت اور رومان پسند خواتین سے باتیں کرتا ہے۔ اس طرح بعض غزلیں پراسرار قسم کی ہوتی ہیں، جس میں شاعر پراسرار عورتوں سے باتیں کرتا ہے۔ اس طرح غزلوں کی کئی اقسام ہوسکتی ہیں، آپ چاہیں تو از خود نوٹس لے کر ان میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں صرف ایک اور غزل کا اضافہ کرنا پسند کریں گے اور وہ ہے ''ہکلی غزل'' ہاں ہکلی غزل بھی ہوتی ہے کیونکہ محبوب ہکلا بھی ہوسکتا ہے۔ دیکھئے شاعر ہیں سید محمد جعفری، ہم بطور ثبوت ان کی ہکلی غزل سے ایک شعر پیش کئے دیتے ہیں۔

م م مجھ میں ت ت تجھ سے میں جو ر ر ر ربط اور ض ض ضبط ہے۔۔۔۔ بلبل اور گ گ گل میں بھی م میانہ چ چمن نہ ہو۔

لیجئے صاحب، میں اس شعر کو ہکلے شعراء اور ان کے ہکلے محبوبوں کے نام معنون کرتا ہوں۔ میں نے بار بار اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ غزل سے مراد، عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔ لیکن یہ ماضی کا نظریہ ہے اور غزل کی نظریاتی حیثیت سے قطع نظر، اس کی عملی صورت یہ ہے کہ ہم نے باقاعدہ عورتوں سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل بیشتر مرد غزل کی عملی صورت پر ہی زیادہ یقین رکھتے ہیں، عصر حاضر میں غزل کا نظریاتی اور عملی تصور پوری قوت سے دکھائی دیتا ہے۔ بہر کیف غزل اچھی ہو تو شاعر مبارک باد کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ایک دوست نے مشورہ دیا ہے کہ مبارک باد دینے سے پہلے کسی عالم سے ضرور دریافت کر لیں کہ بہترین غزل ہونے پر مبارک باد دینا جائز ہے یا ناجائز؟ انشاء اللہ خان انشا کا ایک خوبصورت شعر ہے کہ

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یہاں سب بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

دراصل یہاں معاملہ ایکسپائری ڈیٹ کا تھا، ہمارے مذکورہ دوست نے سوال کیا ہے کہ، ہر شے کی ایکسپائری ڈیٹ ہوتی ہے، کوئی بتائے گا کہ امیر خسرو، میر تقی میر اور غالب کی غزلوں کی ایکسپائری ڈیٹ کیا ہے؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائے کیا

''وارننگ'' ان سطور میں یہ وارننگ دی جا رہی ہے کہ اس مضمون کا مطالعہ صرف وہی خواتین کریں جن کا نام غزل نہیں ہے۔ ورنہ نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوں گی۔

❁❁❁

غزل

کبھی غزل تو کبھی نظم اک بہانہ ہے۔
کسی بھی طور انہیں حال دل سنانا ہے۔

مرے حریف زمانے کا ڈر نہیں مجھ کو
مرے خلاف تو مدت سے یہ زمانہ ہے۔

مری خوشی مرے احباب کو کھٹکتی ہے
میں کیا کروں مری عادت ہی مسکرانا ہے۔

وظیفہ خوار یہ واعظ مجھے نہ سمجھائیں
میں جانتا ہوں مجھے سر کہاں جھکانا ہے۔

ابھی زمین کو ہموار کر رہے ہیں ہم
پھر اس کے بعد یہیں آسماں اگانا ہے۔

وہی غریب جو بستی میں خوبصورت ہے
اسی کے نام سے منسوب ہر فسانہ ہے۔

عجیب شخص ہے فیاض ہم سفر میرا
تمام عمر یونہی روٹھنا منانا ہے۔

ڈاکٹر فیاض احمد علیگ

❁❁❁